

ستاروں کے خواب

ستاروں
کے
خواب

ستاروں کے خواب

(طنزیہ، مزاحیہ مضامین)

مرتب

صہبا لکھنوی
مرزا سعید بیگ

مکتبۂ افکار
ادبستان۔ بندر روڈ۔ کراچی

سلسلۂ مطبوعات مکتبۂ افکار

(۳)

قیمت مجلد:- [redacted]

ناشر:- مکتبۂ افکار، کراچی

طابع:- ٹائمس پریس کراچی

تعداد - ایک ہزار

ترتیب

اُن خوابوں کے نام

جنہوں نے ستاروں کو جنم دیا

نامکمل فلمی قاعدہ
ہمارے فلمی شاعر
ہیروئن کے نخرے

کرشن چندر

نامکمل فلمی قاعدہ

الف سے ایکٹر

بمبئی سے دساور سے پنجاب سے آتا ہے۔ اور یوپی سے آتا ہے۔ اور جب سے فلم انڈسٹری میں بدصورت اداکاروں کی مانگ بڑھ گئی ہے تو حیدرآباد سے بھی آتا ہے۔ ایکٹر کا سینہ چوڑا، ٹانگیں پتلی اور آنکھیں گھٹی ہوئی اور بھنویں منڈی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس کی جیب میں چنے اور منھ میں عبداللہ سگریٹ ہوتا ہے۔ اکثر دادر کے مین روڈ پر ٹہلتا نظر آتا ہے۔

ایکٹر دو قسم کا ہوتا ہے چھوٹا ایکٹر اور بڑا ایکٹر۔ چھوٹے ایکٹر کا حال تو اوپر بیان ہو چکا ہے بڑے ایکٹر کا حال بتاتے ہوئے ذرا ڈر لگتا ہے۔

بڑے ایکٹر کو ریس کا شوق ہوتا ہے۔ وہ گھوڑے اور عورتیں پالتا ہے۔ شراب پی کر بلیرڈ کھیلتا ہے اور میک اپ کرکے بارہ بجے سے پہلے کبھی سیٹ پر نہیں آتا۔ جو ایکٹر جتنا بڑا ہوتا ہے وہ اتنا ہی دیر میں کام پر آئے گا۔ بلکہ بعض بڑے ایکٹروں کا تو حال یہ ہے کہ وہ چھ چھ مہینے کام پر نہیں آتے۔ اکثر فلم کمپنیاں ایسے اداکاروں کی بدولت بہت

جلد ترداں حاصل کر لیتی ہیں۔

الف سے ایکٹرس کالی - پیلی - نیلی - گوری - اُودی - عنابی ایکٹرس ہر رنگ کی ہوتی ہے اور سحر ہونے تک ہر رنگ میں جلتی رہتی ہے ایکٹریس بھی درآمد سے آتی ہے اور اکثر حالتوں میں کسی کے ساتھ بھاگ کر آتی ہے اور بمبئی آ کر کسی ہوٹل میں قیام کرتی ہے۔ اس کے بعد وہ فلم کمپنی میں اپنا جسم بھیجنے جاتی ہے فلم کمپنی میں خوبصورت جسم کو آرٹ کہتے ہیں۔ اور پروڈیوسر سے لیکر سیٹھ کے چپراسی تک آرٹ کے شیدائی نظر آتے ہیں۔ ایکٹر کے مقابلے میں ایکٹرس بہت جلد ترقی کر لیتی ہے اور جتنی ہی زیادہ وہ خوبصورت ہو گی اتنی ہی جلد وہ ترقی کرے گی بعض ایکٹرسوں کو ہیروئن بننے میں کئی سال لگ جاتے ہیں لیکن کئی ایک خوش قسمت ایکٹریسیں ایسی بھی ہیں جو ایک ہی رات میں کامیابی کے تمام مراحل طے کر لیتی ہیں۔ ہر فلم کمپنی ایکٹرس پر چلتی ہے۔ فلمی زندگی کا محور یہی قبالہ ہے۔

ایکٹروں کی طرح ایکٹریسیں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں۔ چھوٹی اور بڑی۔ چھوٹی ایکٹرس اکثر اپنے بھائی یا شوہر کے ساتھ دیکھی جاتی ہے۔ بڑی ایکٹریس اپنے پروڈیوسر کی کار میں۔ کیونکہ اس کا کوئی شوہر نہیں ہوتا۔ کوئی بھائی نہیں ہوتا۔ بڑی ایکٹریس کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے سیٹ پر آن کر سو جاتی ہے اور اس کا موڈ اکثر بگڑ جاتا ہے۔

ب سے بابوجی ہر فلمی عورت جس کا سماجی درجہ ہیروئن کے ساتھ ہوتا ہے وہ اپنے ساتھ ایک بابوجی لیے پھرتی ہے۔ یہ بابوجی بیک وقت خاوند، بھڑوا، عاشق اور غنڈے کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اور بالتفریق مذہب و ملت انجام دیتا ہے اور بابوجی ہندو بھی ہوتا ہے مسلمان بھی ہوتا ہے۔ عیسائی بھی ہوتا ہے، اور اگر ضرورت آپڑے تو سکھ بھی بن جاتا ہے۔ اپنے گھر میں دھوتی، پاجامہ اور شلوار میں ملبوس دیکھا جاتا ہے لیکن اسٹوڈیو

میں کوٹ پتلون پہنے نظر آتا ہی کلائی پر سونے کی گھڑی ہاتھ میں ۵۵۵ کا ڈبہ اور گلے میں سُرخ رومال باندھے رکھتا ہی۔ گھر پر فلمی لڑکی کا سگا بھائی ہوتا ہی۔ اس کا باپ ہوتا ہی۔ ڈرائیور ہوتا ہی۔ باورچی بھی ہوتا ہی۔ لیکن اسٹوڈیو میں اگر صرف بابوجی کہلاتا ہی۔ پروڈیوسر لوگ اس خطرے کی جھنڈی سے بہت بدکتے ہیں اور اُسے منہ مانگی تنخواہ دیتے ہیں۔ جس کا فلمی لڑکی کے کنٹرکٹ میں کوئی ذکر نہیں ہوتا عشق کی طرح بابوجی پر بھی کسی کا زور نہیں ہوتا۔ کیونکہ۔ ہے یہ وہ آتش غالب کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔

پھر ب ۔ سے بمبئی ہی جو ہندستانی فلمی صنعت کا مرکز ہی۔ ب سے بنڈل ہے جو بمبئی کے فلمی عوام کا نعرہ ہی۔ یہ پکچر کیسا؟ بنڈل۔ یہ ڈائرکٹر کیسا بنڈل۔ یہ گانا کیسا؟ بنڈل۔ یہ ایکٹر کیسا؟ بنڈل۔ الغرض جو پکچر آپ ناپسند فرمائیں۔ بلکہ بوگس ہی یہ سب بجو اس ہے۔ ب بلیک میلر ہی۔ ب سے بابوراؤ پٹیل بھی ہی جو نہ بنڈل ہے نہ بوگس۔ اور اپنے نام کے آگے 'بابو' لفظ رکھتے ہوئے بھی بابوجی نہیں ہی بلکہ ایک معروف رسالے کا ایڈیٹر ہے۔

ش سے شاعر فلمی شاعر ادبی شاعر سے ذرا مختلف ہوتا ہی۔ مثال کے طور پر ادبی شاعر گیت کہتا ہی۔ فلمی شاعر گیت لکھتا ہی۔ بلکہ گیت ٹھوکتا ہی جس طرح سے لوگ دیوار پر کیل ٹھوکتے ہیں۔ شاعر بھائی ایسا گیت ٹھوکو کہ سالا لوگ چل چل سے نوجوان بھی بھول جائے۔ (فلمی ڈائرکٹر کا تقاضا) ادبی شاعر کہتا ہی فلمی شاعر نثر لکھتا ہی جس کی سطریں موسیقار نے میوزک ڈائرکٹر کی مرضی کے مطابق چھوٹی بڑی کردی ـــــ ہیں۔ شاعر نے گیت کی سطریں یوں لکھیں وہ پنگھٹ پر آئے۔ وہ پنگھٹ پر آئے۔ ہائے۔ دیکھیے لفظ ہائے۔ اس دھن میں کیونکر بیٹھتا ہی۔ ڈائرکٹر نے کہا

تو لگا دو ناجی۔ ہائے۔ اس کے ساتھ ہی شاعر بھائی نے دست بستہ عرض کیا۔ بجا ارشاد۔ پنگھٹ پہ آئے۔ ہائے ہائے۔ لفظ ہائے اگر تین دفعہ آجائے تو لطف دوبالا ہو دوبالا، اس کو ڈائرکٹر بولا شاعر بھائی اس کو جلدی سے میوزک ڈائرکٹر دبلا دوبالا۔ بناؤ۔ اب گیت کی سطریں یوں ہوگئیں:

وہ پنگھٹ پہ آئے۔ ہائے۔ ہائے۔ ہائے

موسیقار نے پھر گنگنانا شروع کر دیا۔ وہ پنگھٹ پہ آئے۔ ہائے۔ ہائے ہائے۔ ہارمونیم لے کر بیٹھے اور ڈائرکٹر سے اس دُھن کے بارے میں پوچھا کیسی رہے گی یہ دُھن۔ سالی دُھن جمتی نہیں۔ اس فلمی دنیا میں ڈائرکٹر کو کوئی چیز جمتی نہیں۔ نہ پکچر، نہ ڈانس، نہ گانا، نہ مکالمے۔ سالا کچھ جچتا نہیں یہ گانا، اس میں ردھم نہیں۔ نہیں۔ جب تک پکچر ہاؤس میں پاؤں سے کھٹا کھٹ تال نہ دیں۔ یہ گانا بنڈل رہیگا۔ ایں، سمجھے غلام صابر!

ماسٹر غلام صابر نے پھر گنگنانا شروع کیا

وہ پنگھٹ

وہ پنگھٹ

شاعر نے لقمہ دیا

وہ نٹ کھٹ

وہ نٹ کھٹ

ڈائرکٹر نے اصلاح دی وہ جھٹ پٹ

وہ جھٹ پٹ

وہ نٹ کھٹ، جھٹ پٹ، پنگھٹ پر آئے۔ ہائے۔ ہائے۔ ہائے۔ شاعر نے اُچھل کر کہا۔ "گیت ہو گیا، گیت ہو گیا۔ گیت ہو گیا"

ڈائرکٹر نے شاعر کو گلے لگا کر کہا۔ ہاں ہو گیا ہو گیا۔ تو بڑا سالا شاعر ہی تو مہا کوی تلسی داس ہی۔ مہا کوی۔ کالی داس۔ مہا کوی مدھوک۔ مہا کوی ہر دیپ اور مہا کوی مہا پو پادھیا ہے....... جنھوں نے چور بازار اور چندو باز کے گانے لکھے ہیں۔ تو اُن سے بھی بڑھ کر ہو۔ اور تو جوس (جوش) مجاج (مجاز) کا بھی باپ ہی۔ وہ تیرے اوپر کیا گانے لکھیں گے۔ لے یہ چونی اور پالی پولی کھا لے۔ بجار (بازار) سے۔

شاعر اُردو کا ہو تو شاعر اعظم کہلاتا ہی۔ ہندی کا ہو تو مہا کوی۔ لیکن مہا کوی ہو یا شاعر اعظم دونوں کی زبان ایک ہوتی ہے۔ چاہے وہ دوہا ہو گیت ہو۔ غزل ہو یا کوالی۔ فلمی گیت میں اگر چاند۔ پپیہا۔ ندیا۔ برہا۔ جیا۔ مسکائے تڑپائے۔ جلی جائے۔ اگنی۔ طوفان۔ منجدھار۔ بے قرار کا ذکر ہزار بار نہ ہو تو وہ فلمی گیت کبھی پاس نہیں ہوتا۔ بنڈل ہو جاتا ہی۔ ادبی شاعر کے گیت سمجھے جاتے ہیں۔ فلمی شاعروں کے گیت تو نہیں البتہ اُن کی دُھنیں ضروری سمجھی جاتی ہیں اور اسی لیئے وہ لکھے جاتے ہیں معانی اور مطالب سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہی کہ گیت جتنا مہمل ہو گا۔ موسیقار اس کی دُھن اتنی ہی اچھی بنائے گا۔ اسلیئے فلمی شاعر وہی کامیاب ہو سکتا ہی جو صرف ڈڈاں، ڈڈاں، ڈاں پر قناعت کرے۔ فلمی گیتوں کی اصلاح کا خیال دل سے نکال دیجئے۔ نہیں تو خود اسٹڈیو سے کپڑے پھاڑ کر نکل جایئے۔

ادبی شاعر کی طرح فلمی شاعر بھی تخلص کرتا ہے جیسے آہ، واہ، ہا اور اگر ہنسی نے اور زیادہ زور پکڑا تو ہاہاہا - اس کے علاوہ آج کل کی ٹکنی کلر فلم کی مناسبت سے شاعروں نے اپنے تخلص میں مختلف رنگوں کا استعمال بھی شروع کر دیا ہے - جیسے نارنجی اور انگریزی، بابا عالم سیاہ پوش، محمد احمد سبزواری، پیلا پیلا، سُرخ بھیتی، یا سُرخا سُرخ پیلی بھیتی وغیرہ

م سے مکھن یا مسکہ

م سے مکھن جسے بہ زبان بمبئی مسکہ کہتے ہیں، بڑے کام کی چیز ہے دوسری جگہوں پر مکھن کہا جاتا ہے -

بمبئی میں مکھن یعنی مسکہ صرف لگایا جاتا ہے اور اگر ایک بار لگانے سے شفا نہ ہو تو بار بار لگایا جاتا ہے بمبئی میں مسکہ ہر قسم کا ہوتا ہے اور بافراط ملتا ہے لیکن سب سے اچھا مسکہ وہ ہے جو فلمی ڈیری میں پیدا ہوتا ہے - یہ ایسا چکنا دبیز اور گداز ہوتا ہے کہ اُسے لگاتے ہی چہرے کے چھاسے اور دل کے سارے داغ غائب ہو جاتے ہیں اور خبیث سے خبیث صورت فلمی انسان بھی فرشتہ معلوم ہونے لگتا ہے - اس مسکے کے سامنے روغن قاز کی بھی کوئی حقیقت نہیں اور جو لوگ باہر جا کر ولایت تک کو ہاتھ لگا آئے ہیں - اُن کا بھی یہی کہنا ہے کہ بمبئی کا مسکہ اصل ہے اور باقی سب نقل -

اس مسکے کے لگانے کی بھی ایک ترکیب ہے جو دراصل مسکے کی ڈلی کے ہمراہ روانہ کی جاتی ہے تاکہ ہر خاص و عام اس سے فائدہ اٹھائیں اور بارگاہ الٰہی میں بندے کے حق میں دُعا پہنچائیں -

یوں تو مسکہ لگانے کی بہت سی ترکیبیں ہیں، ایک تو وہ ہے جسے بمبئی کے محاورے میں کہا گیا ہے کہ "جیسا منہ ویسا مسکہ" یعنی آدمی جتنا فلمی رتبے کا مالک

ہوگا اسے اسی اعتبار سے مسکہ لگایا جائیگا اور پھر جوں جوں اس کی فلمی حیثیت اور رتبہ کم ہوتا جائیگا مسکہ بھی کم ہوتا جائیگا۔ حتیٰ کہ آخر میں بالکل کھوپرے کا تیل ہو کے رہجائے گا۔ اسی موقع کے لیئے بمبئی والے کہتے ہیں" مسکہ دیکھو مسکے کی دھار دیکھو" لیکن مسکہ پتلا ہو یا گاڑھا دیسی ہو یا ولائتی اسے ہیروئن کو بہرحال لگانا ہی پڑے گا دگرنہ نہ نومن مسکہ ہوگا نہ ہیروئن ناچے گی اور اگر ہیروئن نہیں ناچے گی تو ہندوستانی فلم کیسے بنے گی۔ مسکہ لگانے کی سب سے اچھی ترکیب میرے عزیز دوست شاعر اختر الایمان نے ڈھونڈھ نکالی ہے وہ اس کے موجد نہیں ہیں۔ اُسے انھوں نے اتفاقیہ دریافت کیا ہے۔ چنانچہ اختر الایمان ہدایت کرتے ہیں اور خاکسار آپ سے بیان کرتا ہے کہ بہت دن گذرے ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ عروس البلاد بمبئی میں ایک مشہور و معروف فلمی ڈائرکٹر رہتا تھا جس کا نام صادق تھا۔ ہرچند کہ وہ بے ریا اور پاکباز مرد تھا اور اپنے فن پر یکتائے روزگار تھا لیکن مسکے والے فلکِ ناہنجار کی طرح کہاں کسی کا پیچھا چھوڑتے ہیں۔ چنانچہ یہ مسکے والے اس فلمی ڈائرکٹر کے گھر پر پہنچ جاتے اور اس صفائی سے مسکہ لگاتے کہ جس صفائی سے اس نے خود بھی کسی کو مسکہ نہ لگایا ہوگا اور اس کے بعد اپنا کام حاصل کر کے یہ مسکہ باز شاداں و فرحاں خوشی خوشی کانٹرکٹ حاصل کر کے گھر لوٹتے۔ اور چھوٹتے ہی کسی بار میں بیٹھ کر لال پری کے درشن کرتے کیوں کہ لال پری اور مسکے کا بہت میل جول ہے کبھی مسکہ پہلے آتا ہے لال پری بعد میں۔ کبھی لال پری پہلے مسکہ بعد میں لیکن آتے دونوں ضرور ہیں۔ ہاں جب سے سرکاری طور سے نشہ پانی بند ہوا ہے یار لوگ سرکاری طور پر مسکہ لگاتے ہیں اور غیر سرکاری طور پر لال پری کا بندوبست کرتے ہیں تاکہ مکھن کی دبازت میں اور دماغ کی خباثت میں کوئی کمی واقع نہ ہو۔

روایت کرتے ہیں شاعر اختر الایمان کہ ایک دفعہ وہ چند ماہ سے بیکار بیٹھے اور اس لیئے

مبتلائے صد آزار تھے۔ وہ باندرہ پل پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھے تھے اور نیچے سمندر میں کود جانے کی سوچ رہے تھے کہ یکایک ان کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ مرنے سے قبل ایک دفعہ صادق صاحب کے یہاں جاکر قسمت آزمائی کی جائے۔ اور کھوپڑی ٹکرا نہ نکل آئے۔ یہ سوچتے ہی وہ مردِ ہندی باندرہ پل سے بھاگ کھڑا ہوا اور دوڑتے دوڑتے صادق صاحب کے مکان تک جا پہنچا۔ وہ مشہور و معروف فلمی ڈائرکٹر اس وقت اپنی کہانی میں ایک سین تبدیل کر کے ہیروئن کی نانی کو دلیپ کا رول دے رہا تھا کہ اختر الایمان نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھول کے ڈائرکٹر نے شاعر کو گلے لگالیا۔ اور بڑے تپاک سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کے اُسے صوفے تک لے گیا اور اسے اپنے سامنے بٹھا کے بولا "پہلے پانی پیو گے یا اپنی نظم سناؤ گے"؟۔ اختر الایمان نے کہا "پہلے نظم سناؤں گا کیونکہ اے دوست پانی پلانے والے تو بہت سے مل جاتے ہیں لیکن نظم سننے والا کوئی نہیں ملتا ہے"۔

صادق بہت خوش ہوا اور اختر سے اس کی نئی نظم سننے لگا۔ نظم چونکہ ترقی پسند تھی اس لیے کہیں سکے کی گنجائش نہ رکھتی تھی۔ نظم سُناتے سُناتے اختر کو اس کا برابر خیال رہا اور وہ سوچتا رہا کہ اگر وہ پرانے زمانے کا قصیدہ گو ہوتا تو کیا ہی اچھا ہوتا یا وہ آج کل کے زمانے کا ادب برائے روزگار کا پجاری ہوتا تو وہ نہ صرف ایک قصیدہ لکھتا بلکہ ایک فلمی پرچہ بھی صادق کے نام نکال دیتا کیوں کہ اگر نوشاد کے نام فلمی پرچہ نکل سکتا ہے تو صادق کے نام کیوں نہیں نکل سکتا پھر شاید ایک دن وہ بھی آجائے کہ فوراً اس کے نام ایک پرچہ نکل آئے۔ فلمی ہیروئن سے لے کر ڈھونڈ و سٹنگ بوائے تک کے نام فلمی پرچے نکلنے چاہئیں۔ اختر نے سوچا اس کے بغیر فلم انڈسٹری کا نروان مشکل ہے۔

یہی سوچتے سوچتے اختر الایمان اپنی نظم بھول گیا۔ صادق نے کہا آگے سُناؤ۔ اختر نے جلدی سے جواب دیا "بس یہاں تک لکھی ہے"۔ صادق نے کہا بہت اچھی نظم ہے۔ لیکن اگر تم اسے گیت میں تبدیل کر دو تو میں ۱۹۵۴ء میں اسے استعمال کر لوں گا۔ اختر یہ سُن کر بے حد خوش ہوا کہ چلو آج سے پانچ سال بعد کے روزگار..... کا مسئلہ تو حل ہوا۔ اب ان چار سالوں میں جو ہوگا اُسے کسی نہ کسی طرح بھگت لیں گے۔ یہی سوچ کر وہ آگے مسکہ لگانے کی فکر میں تھا اور جانتا نہیں تھا کہ کونسے نمبر کا مسکہ لگائے کہ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک دُبلا پتلا آدمی گلے میں پان دبائے بھاگتا ہوا اندر آیا اور آتے ہی صادق صاحب کے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کے بیٹھ گیا۔

صادق نے حیران ہو کے پوچھا۔ "کیا بات ہے بھئی؟"

نووارد نے کہا۔ "انگوٹھا نہیں چھوڑوں گا صادق بھائی چاہے کچھ ہو جائے۔"

صادق نے اور بھی پریشان ہو کر کہا۔ "آخر کچھ تو کہو، کیا بات ہے۔"

نووارد نے پھر کہا۔ انگوٹھا نہیں چھوڑوں گا صادق بھائی چاہے جان چلی جائے۔

صادق نے بے حد پریشان ہو کے کہا "مگر آخر کیوں نہیں چھوڑو گے میرا انگوٹھا کچھ بات تو بتلاؤ۔"

نووارد نے پھر اسی لہجے میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "انگوٹھا نہیں چھوڑوں گا۔ ایک بات ہے وہ آپ کو پوری کرنی ہوگی، صادق بھائی ورنہ حشر تک آپ کا انگوٹھا نہیں چھوڑوں گا۔"

اور یہ کہہ کر نووارد نے صادق کے پاؤں کا انگوٹھا اور بھی مضبوطی سے پکڑ لیا اور جم کر فرش پر بیٹھ گیا۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے صادق کے چہرے پر ایک معصوم سی

مسکراہٹ آئی اور ایک ایسی ہی مسکراہٹ اختر کے لبوں پر بھی آئی گو وہ اتنی معصوم نہیں تھی۔ اور سُنا ہو کہ نو وارد نے اپنی بات پوری کرائی اور جب بھی اس نے دیر تک صادق کا انگوٹھا نہیں چھوڑا لیکن یہ بھی روایت ہے کہ اختر اس کے بعد وہاں سے فوراً ہی چل دیے۔ اور جب ان کے ایک عزیز دوست نے ان سے پوچھا "تم وہاں کیوں نہیں بیٹھے جس کام کے لیئے تم گئے تھے اُسے پورا نہیں کیا۔" تو اختر نے اک آہ بھر کے جواب دیا "اے جان نثار غم گسار عزیز دوست تو ہی بتا جب اس نو وارد نے مسکے کے لیئے صادق کا انگوٹھا پکڑ لیا۔ تو میں کیا پکڑتا؟"

جاں نثار دوست یہ سُن کر چپ ہوگئے۔ اسی دن سے فلمی دنیا میں انگوٹھا پکڑنے کی رسم عام ہو چکی ہو۔ مرد کا انگوٹھا پکڑا جاتا ہو اور عورت کی انگوٹھی پکڑی جاتی ہے۔ اگر پکڑنے والا سمجھ دار ہو اور عورت ہیروئن ہو تو اس کے سارے کے سارے زیور غائب کر دیئے جاتے ہیں مگر اس کے لیئے کمال مشق اور مہارت کی ضرورت ہے۔ سُنا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں اس فن کے اب چند ہی اُستاد باقی رہ گئے ہیں۔

نئے لوگ جو آئے ہیں وہ اس فن میں مشاق نہیں ہیں۔ یہ لوگ ہر راہ بے حیائی سے گلی گلی مسکہ لگاتے ہوتے ہیں اور میونسپل کارپوریشن والے ان نئے جھاڑیوں سے کسی قسم کا تعرض نہیں کرتے کہ انھیں بھی اس چیز کی کبھی نہ کبھی ضرورت پڑ جاتی ہو۔

آج کل بمبئی کے لوکل اسٹیشنوں پر جہاں آپ کو تیل مالش والے اور بوٹ پالش والے ملیں گے وہاں مسکہ باز بھی مل جائیں گے جو ہتھیلی پر مسکے کی ڈلی لیئے گھومتے ہیں اور چلا چلا کے کہتے ہیں "مسکہ لگوالو مسکہ لگوالو۔" تیل مالش دو آنے میں ہوتی ہو اور مسکہ پالش صرف دو پیسے میں ہو جاتا ہو۔ اسی لیے تو مجھے بمبئی شہر

بہت پسند ہے۔ ہاں جس روز میری جیب میں ایک آنہ ہوتا ہے۔ میں دو پیسے کے چنے لیتا ہوں۔ دو پیسے کا مسکہ لگواتا ہوں۔ اور اس کے بعد یا ندرہ پل پر ٹانگیں لٹکا کے بیٹھ جاتا ہوں اور تعریف کرتا ہوں بچو! اس خدا کی جس نے مسکہ بنایا۔

ابتدائی مسک (مشق)

بچہ انگوٹھا چوس رہا ہے۔ باپ انگوٹھا پکڑ رہا ہے۔ دونوں سے مسکہ نکل رہا ہے۔ یہ ہیروئن ہے۔ وہ مسکہ کی ڈلی ہے۔ بیچ میں نانی کھڑی ہے کتے کو مسکہ ہضم نہیں ہوتا۔ باقی سب کو ہو جاتا ہے۔

مسکے کو مسکا ملے کر کے لمبے ہات ۵
اور تلسی داس غریب کی کوئی نہ پوچھے بات

تلسی داس غریب کون تھا، اس کا اختر الایمان سے کیا رشتہ ہے۔ جواب کے لیئے انگوٹھا پکڑ یئے۔

ہمارے فلمی شاعر

فلمی شاعر ادبی شاعر سے کچھ مختلف ہوتا ہے مثال کے طور پر اتنا سمجھ لیجئے کہ ادبی شاعر نظم یا گیت لکھتا ہے اور فلمی شاعر گیت لکھتا نہیں بلکہ گیت ٹھونکتا ہے جس طرح لوگ دیوار میں کیل ٹھونکتے ہیں۔

ہدایت کار فلم بناتے وقت فلمی شاعر سے کہتا ہے شاعر صاحب ایسا گیت ٹھوکئے کہ سالا لوگ "چل چل رے نوجوان" بھی بھول جائے۔

بعض ادبی نقاد کہتے ہیں کہ فلمی شاعر نظم نہیں نثر لکھتا ہے جس کی سطریں ہدایت کاروں کی مرضی کے مطابق چھوٹی یا بڑی کر دی جاتی ہیں۔ اب مثال سنیے:۔

فلمی شاعر نے گیت کا پہلا مصرعہ لکھا "وہ پنگھٹ پر آئے" میوزک ڈائرکٹر نے گنگنانا شروع کیا:

وہ پنگھٹ پر آئے، وہ پنگھٹ پر آئے، ہائے،

دیکھئے لفظ ہائے اس دھن میں کیسا فٹ بیٹھتا ہے۔ "ہائے" سنتے ہی ہدایت کار

اچھل پڑتے ہیں اور انھوں نے شاعر سے کہا " لگا دو نا ہائے شاعر صاحب' اسکے ساتھ۔
اور شاعر صاحب نے دست بستہ عرض کی "جو ارشاد"۔
"وہ پنگھٹ پر آئے ہائے ہائے ہائے "
"لفظ" ہائے اگر تین بار آجائے تو مزہ آجائے"۔ میوزک ڈائرکٹر نے کہا اور اب
شاعر صاحب کا گیت یوں ہو گیا۔
وہ پنگھٹ پر آئے ہائے ہائے ہائے۔ پھر اس نے ہدایت کار سے پوچھا
" یہ دھن کیسی رہے گی "۔
ہدایت کار نے کہا " سالی دھن جمتی نہیں ۔ سچ پوچھئے تو فلمی دنیا میں ہدایت کار
کی کوئی چیز بھی نہیں جمتی نہ پکچر نہ ڈانس، نہ گیت نہ مکالمہ۔
پھر انھوں نے کہا " سالا گانا اس وقت جمتا ہے جب پبلک تال دے۔ اگر فلم
دیکھتے وقت تماشائی گانے پر تال نہ دینے لگیں تو وہ گانا ہی کیا۔ یہ گیت بنڈل ہو جائے گا۔
سمجھے غلام ناصر ! ایں !!"
میوزک ڈائرکٹر مسٹر غلام ناصر نے پھر گنگنانا شروع کیا" وہ پنگھٹ ، وہ پنگھٹ "۔
شاعر صاحب نے بھی درمیان میں مدد دی "وہ نٹ کھٹ ، وہ نٹ کھٹ "۔ پورا گیت
اب اس طور پر ہو گیا۔
وہ نٹ کھٹ ، جھٹ پٹ ، پنگھٹ پہ آئے ہائے ، ہائے ، ہائے۔
شاعر صاحب اچھل پڑے ، گیت پورا ہو گیا۔ ہو گیا۔
ڈائرکٹر نے انھیں اپنے گلے سے لگاتے ہوئے کہا ۔ شاعر صاحب ، تم سالا شاعر
نہیں ، شاعرِ اعظم ہو۔ جہانگیر ہو ، تم تلسی داس ہو ، بلکہ اس سے بھی بڑھیا ہو۔ لو یہ چونی اور پوری

کھاد بازار سے!!!

فلمی شاعر اگر ہندی کا ہے تو مہاکوی کہلاتا ہے اور اُردو کا ہے تو شاعرِ اعظم لیکن وہ مہاکوی ہو یا شاعرِ اعظم زبان اور بھاشا دونوں کی ایک ہوتی ہے۔ دوہا ہو، گیت ہو، غزل ہو یا قوالی۔ فلمی گیت میں اگر چاند، پپیہا، ندیا، برہا، جیالے، تڑپا رے، ساحل، طوفاں، منجدھار وغیرہ کا ذکر ہزار بار نہ ہو تو گیت پاس نہیں ہوتا اور بنڈل ہو جاتا ہے۔ ادبی شاعر کے گیت سمجھے جاتے ہیں۔ فلمی شاعروں کے صرف سُنے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ معانی اور مطالب سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ فلمی گیتوں کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ جتنا بے معنی ہوگا اتنی ہی اچھی دھن میوزک ڈائرکٹر بنائیگا۔ اس لیے فلمی شاعر وہ کامیاب ہو سکتا ہے جو ڈا، ڈا، ڈا، ڈا، ڈا، ڈا پر اکتفا کرے۔ اگر وہ ادبیت کے چکر میں پڑا تو کان پکڑ کے اسٹوڈیو سے نکال دیا جائیگا۔

فلمی شاعر بھی اپنا فرضی نام یا تخلص رکھتا ہے۔ جب سے ہمارے یہاں رنگین فلموں کا آغاز ہوا ہے اس وقت سے فلمی شاعروں نے بھی اپنے تخلص کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ جیسے تاریخی اور انگریزی بابا عالم سیاہ پوش۔ محمد سبزواری۔ پیلا پیلا سرخ بھیلتی یا سُرخ سرخ پیلی بھیتی۔ خدا بچائے آپ کو ان فلمی شاعروں سے۔

ہیروئن کے نخرے

فلم کی دنیا تیز روشنی اور تیز پروپیگنڈے کی دنیا ہے۔ فلمی رسالوں اور فلمی پرچوں میں آپ جس ہیروئن کا چہرہ دیکھتے ہیں۔ وہ بڑا ہی دلکش اور خوبصورت ہوتا ہے۔ ہیروئن کے کردار کو اور اس کے اطوار کو فلمی روشنی میں اس کے تمام زاویے دُرست کر کے اُنھیں درست صورت میں اس لیے پیش کیا جاتا ہے تاکہ پڑھنے والے تماشائی ہیروئن کے حُسنِ صورت اور حُسنِ سیرت دونوں سے متاثر ہو کر بار بار اسی ہیروئن کی تصویر دیکھتے جائیں اور ان کی آنے والی تصویروں کی تمنا میں شب و روز گُھل گُھل کے فراق کی گھڑیاں گنا کریں۔ فلمی اصطلاح میں اسے "پبلسٹی کا فن" کہتے ہیں۔ عام اصطلاح میں اسے دھوکہ بازی اور چار سو بیس بھی کہا جا سکتا ہے۔

نام لینے سے کیا فائدہ اور پھر نام کے لیے عدالت میں جانے سے کیا فائدہ مثال کے طور پر مس گمنامی چار بچوں ۔ مس گمنامی چار بچوں کی ماں ہیں اور باقاعدہ شادی شدہ ہیں۔ اس کے باوجود بھی مس کہلاتی ہیں۔ میں نے ایک روز اس کے معنی لغت میں دیکھے معلوم ہوا، یہ کنواری لڑکیوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ مگر جب سے ہیروئنوں نے اپنے لئے استعمال کرنا شروع

کیا ہے کنواری لڑکیاں انگریزی لغت بنانے والے پر دعویٰ کرنے کی سوچ رہی ہیں -)

ہاں تو چلیئے ! مس گمنامی ہی سے شروع کیجئے - مس گمنامی کے متعلق مشہور ہے کہ آپ کو اپنے گھر سے، اپنے شوہر سے، اپنے بچوں سے بڑی دلچسپی ہے - انکی اکثر تصویریں اسی خیال انگیز تصور کی مناسبت سے شائع ہوتی ہیں - یعنی جب دیکھو، اپنے بچوں میں کھیل رہی ہیں - اپنے شوہر کیلئے ناشتہ تیار کر رہی ہیں تکیوں کے لیئے غلاف سی رہی ہیں - محترمہ چونکہ اکثر دیوی دیوتاؤں کی تصویروں میں کام کرتی ہیں - اس لیئے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بٹھانا بہت ضروری ہے کہ مس گمنامی بڑی ہی گھریلو قسم کی عورت ہیں - پتی ورتا، صاف ستھری بچوں میں گھری ہوئی آدرش ماں !-

ایک روز میں نے سوچا - چلو، چل کے مس گمنامی سے ایک انٹرویو ہی لے آؤں - تین دفعہ کوشش کی، تینوں دفعہ گھر کی ماما سے ہی ملاقات ہو سکی - پتہ چلا کہ مس گمنامی چونکہ کئی تصویروں میں کام کر رہی ہیں - اس لیئے گزشتہ بیس دن سے وہ گھر ہی نہیں آسکیں - بچے ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں - شوہر خودکشی کرنے کے لیئے مہابلیشور چلا گیا ہے - گھر میں ایک ماما ہے جو دن رات ریڈیو پروگرام بجاتی رہتی ہے اور آس پاس کے نوکروں سے عشق کرتی رہتی ہے -

میں نے ماما سے پوچھا " اگر گھر میں مالکن نہیں ہیں تو کیا ہوا، میں مالکن کا گھر تو دیکھ سکتا ہوں گھر دیکھنے سے گھر کی مالکن کا اندازہ ہو سکتا ہے !! ماما کچھ ہچکچائی مگر جب اس نے میرے گنجے سر کی طرف دیکھا اور پانچ روپے کے نوٹ کی طرف دیکھا تو اسے اطمینان ہو گیا - وہ مجھے گھر کے اندر لے گئی -

ڈرائنگ روم میں ہنوز گرد چڑھی ہوئی تھی - فلمی رسالوں اور پرچوں کے انبار لگے ہوئے تھے - ڈرائنگ روم سے بیڈ روم میں گھسا تو وہاں بھی یہی حالت نظر آئی - تکیوں

کے غلاف غائب تھے اور بستر پر دو چوہے مرے پڑے تھے۔

میں نے پوچھا "تکیوں کے غلاف کیا ہوئے؟ دھوبی کے ہاں گئے کیا؟"

"نہیں تو!" ماما فوراً بولی "ہمارے یہاں تکیوں کے غلاف تکیوں پر چڑھانے کے لئے نہیں شوہر کی آنکھوں پر چڑھانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ مگر وہ تو اب مہالیشور چلے گئے ہیں۔ اس لئے ان تکیوں کے غلافوں کو اب میں چائے دانی کے اوپر چڑھانے کے لئے استعمال کرتی ہوں۔"

"بہت اچھا کرتی ہو!" میں نے ماما کی طرف مسکرا کر کہا۔ ماما جواب میں مسکرائی اور ہیروئن کی ساڑھی کا پلو ٹھیک کرنے لگی جو اس نے اس وقت خود پہن رکھی تھی۔

بیڈ روم سے میں کچن میں گھسا۔ کچن میں سب برتن موجود تھے۔ مگر چولہا نہیں تھا۔ ایک طرف پرات اوندھی پڑی تھی۔

میں نے کہا

یہ پرات ہے نا۔ آٹا گوندھنے کے لئے اسے مس گمنانی کام میں لاتی ہونگی،

"جی نہیں" ماما بولی "اوندھی پرات کے اوپر مس گمنانی کھڑے ہو کر منی پورڈانس کرتی ہیں۔ وہ اس چھوٹی سی پرات کے اوپر سارا ڈانس کرلیتی ہیں"

"کمال ہے!" میں نے حیران ہو کے کہا۔ اتنے میں میری نظر بیلنے پر پڑی۔ بیلنا کچن کے عین مرکز میں فرش پر پڑا تھا۔ میں مسرت سے اچھل پڑا۔ میں نے خوشی سے چلا کے ماما سے پوچھا۔

"کیا یہی وہ تاریخی بیلنا ہے جس کی تصویر اخباروں میں کئی بار چھپ چکی ہے

اسی بیلنے کی مدد سے مس گمنانی کو ان تصویروں میں کچن میں بیٹھے ہوئے چپاتیاں تیار کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔" میں نے بڑے احترام سے اس بیلنے کو فرش پر سے اٹھالیا۔ اور اسے بار بار اپنے ہاتھوں میں گھما کر دیکھنے لگا۔

" تو یہ ہے وہ تاریخی بیلنا جس سے مس گمنانی اپنے شوہر کے لیے چپاتیاں تیار کرتی ہیں ؟"

"جی نہیں" ماما نے کہا۔

وہ تو اس بیلنے کو شوہر کے سر پہ مارنے کے لئے کام میں لاتی ہیں۔ یہ اس طرف خون کے نشان دیکھئے۔

بیلنا میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پہ جا گرا۔ میں جلدی سے کچن سے باہر نکل گیا۔ دوسرا کمرہ بہت صاف ستھرا تھا۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا یہ کس کا کمرہ ہے ؟

ماما نے جواب دیا۔ "یہ میرا کمرہ ہے"۔

میرا دوسرا انٹرویو مس چن مینا سے ہوا۔ مس چن مینا کو باغبانی سے بہت شوق ہے۔ کبھی وہ ایک پکچر میں کام کرنے کے لئے ایک لاکھ روپے لیتی تھیں۔ آج دس ہزار پر بھی کام کرنے پہ آمادہ ہیں۔ مگر فی الحال کوئی گاہک نظر میں نہیں ہے۔ اس لئے باغبانی کا شوق فرماتی ہیں۔ مس چن مینا کو اپنے باغیچے میں جھاڑیاں کاٹنے کا بہت شوق ہے اور جب اس سے فرصت ملے تو تاج میں اپنے بال کٹواتی رہتی ہیں اور جب اس کام سے فرصت ہو تو کسی تگڑے پروڈیوسر کی جیب کاٹنے کی فکر رہتی ہیں۔

ان کی اکثر تصویریں اس انداز سے شائع ہوتی ہیں کہ اپنے باغیچے میں ہیں اور کسی بیل کی مرمت کر رہی ہیں کسی غنچے پر جھکی ہوئی خود غنچہ دہن ہیں اور مسکراتے ہوئے پھولوں میں خود بھی مسکرا رہی ہیں۔ چنانچہ جب میں ان سے ملنے کے لئے ان کے باغیچے میں داخل ہوا تو وہ ایک قسم کا شاندار پوز بنائے۔ بڑے ہی لچکیلے انداز میں کھڑی تھیں۔

میں نے معذرت چاہی اور کہا معاف کیجئے گا۔" میں اپنا کیمرا ساتھ نہیں لایا۔" مس چن منیا کا چہرہ اتر گیا۔

مُنہ پھلا کے بولیں۔ تو پھر انٹرویو کی کیا ضرورت ہے۔

میں نے کہا۔ انٹرویو قلمی بھی تو ہو سکتا ہے۔

مس چن منیا نے کہا "میرا قلم تو صرف کنٹریکٹ پر دستخط کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے آپ فی الحال یہ قلمی آم دیکھئے۔ یہ رتناگری سے منگوائے ہیں۔ یہ کہہ کر مس چُن منیا مجھے مولسری کے درختوں کے جھنڈ میں لے گئیں۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ مس چن منیا کو باغبانی سے اس قدر شغف ہے کہ آپ آم اور مولسری کے پیڑ میں تمیز نہیں کر سکتیں۔ سفید گلاب اور سفید چنبیلی کے پھول کا فرق انھیں معلوم نہیں جو گن دلیا کو آپ گل دادی کہتی ہیں اور گل دادی کو گل شبّو!

تھوڑی دیر اسی باغیچے میں ٹہلنے کے بعد میں نے کہا۔ "آپ کے باغیچے میں اور سب کچھ ہے، مگر نرگس نہیں ہے۔"

مس چُن منیا ناک سکوڑ کے بولیں۔ "اونہہ۔ نرگس کا یہاں کیا کام۔

آپ کو۔ اگر نرگس سے انٹرویو کرنا تھا تو میرے پاس کیوں آئے؟"

میں نے کہا" میں نرگس ہیروئن کی بات نہیں کر رہا۔ نرگس ایک پھول کا نام ہے؟" "جب تو میں ضرور اسے اپنے باغیچے میں لگادوں گی ——— بتا سکتے ہیں کہاں سے ملے گا۔"

" ہمالیہ کے دامن میں ملے گا۔ چھ ہاتھ کا پیڑ ہوتا ہے۔ اور اس پر دو دو گز کے لانبے پھول لگتے ہیں۔"

"(HOW LOVELY) میں ضرور اپنے باغیچے کے لئے منگواؤں گی۔ ہمالیہ کا دامن کہاں ہے؟"

" پیرس میں!"

" پیرس میں؟ واہ واہ، پھر تو میں ضرور منگواؤں گی۔ ابھی تار کرتی ہوں مگر ایک تکلیف ہوگی۔ یہ پھول بڑے نازک ہوتے ہیں اور ان کے لئے کھاد بھی بڑی محنت سے تیار کی جاتی ہے، کیونکہ اس کھاد میں گھوڑوں کا خون شامل کیا جاتا ہے۔"

"آپ فکر نہ کیجئے، گھوڑوں کا خون میں ریس کورس سے منگا لوں گی۔"

مس چن منیا کے بعد میں مس تن تنیا سے ملا۔ مس تن تنیا کا کوئی گھر نہیں ہے۔ کیونکہ انہیں گھر جانے کی فرصت ہی نہیں ہے۔ بیس پکچروں میں کام کرتے ہوئے ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہے کہ اپنے لئے کسی گھر کے بارے میں سوچ سکیں۔ اس لئے ہوٹل میں نام لکھا رکھا ہے اور دن رات سیٹ پر رہتی ہیں۔ ناچار مجھے بھی فلم" اندھی محبت" کے سیٹ پر جانا پڑا

جہاں وہ دن میں تین گھنٹے شوٹنگ کرتی ہیں۔ اس کے بعد وہ تین گھنٹے "اندھی نفرت" میں شوٹنگ کریں گی۔ وہاں سے گمراہی کی شوٹنگ پہ جائیں گی۔ تین گھنٹوں کے بعد "گمنام" کی شوٹنگ ہو گی۔ وہاں سے "گئو دان" کی شوٹنگ پر جائیں گی اور وہاں سے فارغ ہو کے "گئو ہتھیا" کے سیٹ پر چلی جائیں گی۔ پھر ایک گھنٹے کے لئے "جھانسی کی مہارانی" میں کام کریں گی اور وہاں سے فراغت پا کے "جھانسی کی رانی کی رانی" کے سیٹ پر چلی جائیں گی۔ اسی طرح ہیروئنوں کے نخرے ہوتے ہیں اور جیسے نخرے بھی ہوتے ہیں۔ اور جتنے جیسے نخرے زیادہ ہوں اتنے ہی نخرے زیادہ ہوتے ہیں۔

مس تن تنیا نے مسکرا کے مجھ سے کہا "یہ شاٹ ہو لے تو آپ کو پانچ منٹ دوں گی۔"

کیمرہ تیار ہے۔ ساؤنڈ بھی۔ ڈائرکٹر بھی۔ ہر شخص چاق و چوبند نظر آتا ہے ہیروئن بولنے لگی۔

"ارے مردوئے، تمہیں شرم نہیں آتی، میرے سامنے دیدے پھاڑے بے شرموں کی طرح.....!"

"کٹ کٹ" ڈائرکٹر زور سے چلایا "یہ کونسا مکالمہ آپ بول رہی ہیں!"

"ساری ساری!" ہیروئن نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"میں غلطی سے "اندھی نفرت" کے ڈائیلاگ بول گئی۔ پھر چلئے۔"

کیمرہ پھر چلا۔ ڈائرکٹر چلایا اسٹارٹ۔!

ہیروئن بولنے لگی۔ "جو گئو ہتھیا کرتا ہے، وہ گویا اپنی ماں کی ہتھیا کرتا ہے

ہزاروں سالوں سے گئو ماتا کا درجہ۔"

"کٹ کٹ" ڈائرکٹر پھر زور سے چلایا۔ "آپ پھر ڈائیلاگ بھول گئیں

"ساری! میرے دماغ میں گئو ہتھیا کے ڈائیلاگ گھوم رہے ہیں:"

ڈائرکٹر نے کہا۔ "آپ تھوڑی دیر آرام کرلیں۔"

"شکریہ"

ہیروئن ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئی وہ اس سے پہلے تین پکچروں میں کام کرکے آئی تھی۔ اس لئے بہت تھکی تھکی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اس نے تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ جونہی اس نے آنکھیں بند کیں وہ آرام کرسی پر گہری نیند میں کھوئی گئی۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ دوسرا گھنٹہ گزر گیا۔ تیسرا گھنٹہ گزر گیا۔

ڈائرکٹر نے کہا۔ پیک آپ!

ہیروئن کو ڈائرکٹر کی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ مگر سیٹ پر بیٹھے بیٹھے وہ سو گئی۔ تھوڑی دیر تک ڈائرکٹر کسی نہ کسی طرح آنکھیں کھولے گاڑی چلاتا رہا۔ مگر وہ بھی تین دن تین راتوں سے اپنے سیٹ پر اس ہیروئن کا انتظار کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ اس لئے تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی اپنی سیٹ پر سو گیا اور گاڑی خود بخود چلتی گئی۔ اور ڈائرکٹر کے گھر کی طرف بھاگتی گئی۔ پھر ڈائرکٹر کا گھر آیا۔ پھر ڈائرکٹر کا گراج سامنے آیا۔ خود بخود موٹر رک گئی آپ ہی آپ موٹر کے دروازے کھل گئے اور آپ ہی موٹر گراج کے اندر داخل ہوگئی۔ پھر گراج کے دروازے بھی آپ ہی بند ہوگئے بمبئی میں ایسا ہی ہوتا ہے ایسا ہی ہوتا رہیگا جسکو یقین نہ آئے بمبئی آکے دیکھ۔

۱۔ ریکارڈ سُنیئے

۲۔ پردۂ سیمیں

۳۔ فلم ڈائرکٹر

۴۔ فلمی پارلیمنٹ

ابراہیم جلیس

ریکارڈ سنئے

یہ محض ایک سُنی سُنائی بات ہے۔ ممکن ہے۔ جھوٹ ہو۔ ممکن ہے سچ ہو۔ یا پھر دونوں نہ ہوں۔ بلکہ دونوں کے درمیان کی کوئی چیز ہو۔ مگر یہ بات کسی نہ کسی طرح میرے علم میں آگئی۔ بات چونکہ بڑی انوکھی اور نادر ہے اور میں فطرتاً علم کے معاملے میں بخالت سے کام لینا گناہ سمجھتا ہوں۔ اس لئے آپ کو بتائے دیتا ہوں۔ مگر اس وعدہ اور اس شرط پر کہ یہ بات بالکل راز میں رہے اور سوائے میرے آپ کے اور آل مائٹی خدا کے کسی کو معلوم نہ ہو۔ آپ قسم نہ کھائیں۔ مجھے تو آپ کی شرافت پر پورا پورا اعتماد ہے۔ میں تو بغیر مطالبۂ حلف کے آپ کو بتا رہا ہوں مگر پھر بھی احتیاط رکھئے۔ کیا معلوم بھُول کر آپ سے یہ راز فاش ہو جائے اور مجھ جیسا کوئی بدنیت ادیب اخبار میں چھاپ دے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر یہ سمجھئے کہ میرا اور آپ کا بیڑا غرق۔ اپنا اور میرا بیڑہ غرق کرنے کے خیال کو اپنے دل سے بالکل اسی طرح نکال دیجئے۔ جس طرح ہمارے سرمایہ دار

لیڈروں نے انگریزی سامراج کو اپنے وطن سے نکال دیا ہے۔ یعنی نکالا بھی ہے اور نہیں بھی نکالا۔

اوہ آپ تو بڑے بیتاب نظر آرہے ہیں۔ ہاں جی راز کی بات سننے کے لئے آدمی ایسا ہی بیتاب اور بے چین ہوتا ہے۔ کیا آپ نے قدیم یونان کے مشہور بادشاہ قلفاقیل کی وہ کہانی نہیں سُنی۔ جس نے اپنی ملکہ طوطیان کے بارے میں بڑا پُراسرار راز سُننے کی بیتابی میں اپنے ہوشمند وزیر فلن فلاف کو قتل کر دیا تھا۔ راز کی بات ہوتی ہی کچھ ایسی بے تاب کُن ہے کہ کیا بادشاہ کیا فقیر سب بیتاب ہو جاتے ہیں۔

مجھے چونکہ آپ کی بیتابی کا امتحان لینا ہرگز مقصود نہیں ہے۔ اس لئے اپنا کان قریب لایئے تاکہ میں آپ کو وہ راز کی بات سنا دوں اور کوئی تیسرا اس کا ثواب حاصل نہ کر سکے۔

ہاں تو جناب وہ راز کی بات یہ ہے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ہندوستان اور پاکستان کو آزادی ملی اور دونوں ملکوں کے شہروں میں جشنِ آزادی بڑی دھوم دھام سے منایا گیا تو آل انڈیا ریڈیو سے آپ کی فرمائش کے پروگرام میں ہمارے سیاسی لیڈروں کی پسند کے ریکارڈ پیش کئے گئے۔ راوی نے اس دلچسپ پروگرام کی تفصیل یوں بتائی ہے۔ کہ پندرہ اگست کی رات کے دس بجے آپ کی فرمائش کے عنوان سے یہ پہلا ریکارڈ پنڈت جواہر لال نہرو کا بجایا گیا جو یہ تھا۔

"دور ہٹو! دُور ہٹو اے دنیا والو ہندوستان ہمارا ہے"

مسز وجے لکشمی کی پسند کا ریکارڈ تھا۔

" میرے بھیّا نے پہنا ہے تاج رے "

نواب زادہ لیاقت علی خاں کی پسند کا ریکارڈ تھا۔

" توحید کے پرچم کو جب غازی اٹھالیں گے "

اور اس کے بعد لارڈ مونٹ بیٹن کی پسند کا ریکارڈ بڑے اہتمام سے بجایا گیا۔

" آئی آئی مصیبت آئی۔ مسافر بھاگ چلو "

نظام حیدر آباد کی پسند کا ریکارڈ

" جب تم ہی چلے پردیس لگا کر ٹھیس، او پریتم پیارا

دنیا میں کون ہمارا "

سردار ولبھ بھائی پٹیل کی پسند کا ریکارڈ

" اے دُور جانے والے وعدہ نہ بھول جانا "

سیٹھ برلا کی پسند کا ریکارڈ

" او جانے والے بالموا

لوٹ کے آ، لوٹ کے آ "

سیٹھ اصفہانی کی پسند کا ریکارڈ

" ایک بار پھر سے آجا — آجا

دل میں مرے سما جا "

سارے مہاراجگان اور مہارانیوں کی پسند کا ریکارڈ

"دن خوشی کا چھپ گیا، رات غم کی آگئی"

پورن چند جوشی کی پسند کا ریکارڈ

"مزدور ہی بدلے گا تقدیرِ جہاں ساتھی"

سجاد ظہیر کی پسند کا ریکارڈ

"اب لے کے لال جھنڈا بھیا آگے بڑھتے جانا
سر کٹتا ہے تو کٹ جائے جھنڈا نہ جھکانا"

اور سب سے آخر میں انڈین کریچین سوسائٹی کی صدر میڈم فیلڈن کی پسند کا ریکارڈ بجایا گیا۔

"وہ اپنی یاد دلانے کو اک عشق کی دنیا چھوڑ گئے"۔

ممکن ہے کہ یہ راز کی بات آپ کو بالکل سفید جھوٹ اور محض گپ نظر آئے چنانچہ مجھے یہ بات نہ صرف سفید بلکہ رنگ برنگا جھوٹ نظر آتی۔ بھلا کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے لیڈر پختہ عقل اور پختہ مغز لیڈر اسکول کی لڑکیاں اور لڑکوں کی طرح "فرمائشی پروگرام" میں حصہ لیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہرگز نہیں ہوا اور آئندہ بھی ہرگز نہ ہوگا۔

ہاں! البتہ ریڈیو پر فرمائشی پروگرام پہلے کی طرح ہمیشہ ہوتے رہیں گے اور زندہ دل نوجوان عورتیں بچے اور بوڑھے ہر ہفتہ اپنی اپنی پسند کے ریکارڈ سنا کریں گے۔ جو مر جائیں گے اور زندہ رہیں گے۔ وہ برابر سنتے رہیں گے۔

مرنے والے نہ سنیں یا جینے والے سنیں۔ ان دونوں باتوں کا اصل پروگرام پر قطعاً کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ پاکستان اور ہندوستان کی ساری نشرگاہوں سے یہ واحد پروگرام ایسا ہوتا ہے۔ جسے ہر طبقہ اور ہر عمر اور ہر مزاج اور ہر قومیت اور ہر مذہب اور ہر رنگ اور ہر نسل کا آدمی بڑے شوق سے سُنتا ہے اور سر دھنتا ہے یعنی بہت پسند کرتا ہے۔

بعض بیکار فلسفیوں نے اس پروگرام کے سُننے والوں کے نفسیاتی تجربوں کی ایک مہم جاری کر رکھی ہے۔ جس طرح علم شناخت کے ماہرین کسی انسان کے چہرے مہرے حرکات سکنات رہن سہن، بول چال، طرزِ تحریر اور دستخط سے اس کا کردار معلوم کر لیتے ہیں، بالکل اسی طرح بعض ماہرین علوم غیب کی پسند کا ریکارڈ سُن کر بھی اس کے کردار اور شخصی زندگی کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر سکتے ہیں۔

میرے ایک دوست مسٹر فرید احمد فاروقی اس غایت کو پیشِ نظر اور پسِ ذہن رکھ کر ہر ہفتہ ریکارڈوں کا فرمائشی پروگرام سُنا کرتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان اور پاکستان کی ساری نشرگاہوں کے فرمائشی پروگراموں کے بارے میں ایک چارٹ تیار کیا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ دونوں ملکوں میں لوگوں کی داخلی زندگی کا کیا کردار ہے۔ چنانچہ تازہ ترین ریکارڈ یہ ہے۔

سال	ریڈیو اسٹیشن	فرمائش کرنے والے
۱۹۴۸ء	۱۲ عدد	۱۲۰۰۰

اب ان بارہ ہزار فرمائش کرنے والوں کی تقسیم ان کے ذہنی رجحانات و کیفیات کے ماتحت یہ ہے :-

۸۰۰۰	نے محبت کا آغاز کیا ہے
۱۰۰۰	محبت کر رہے ہیں
۲۰۰۰	محبت میں ناکام ہو چکے ہیں
۲۰۰	شرابی
۱۰۰	طوائفیں
۳۰۰	بے فکرے
۲۰۰	تاجر پیشہ لوگ
۱۰۰	والدین
۱۰۰	خدا ترس مذہبی لوگ

میرے ایک ملاقاتی جن کا نام سید لطف علی ہے اور جن کے نام کا انگریزی ترجمہ سید پلیثر علی ہے۔ جو بہت ہی کالے بہت ہی موٹے اور بہت ہی لمبے ہیں۔ چونکہ ہیں سید لطف علی اس لئے بغیر لطف یعنی فرمائشی پروگرام کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ جس نشر گاہ سے فرمائشی پروگرام ہو۔ اس وقت اپنا اہم سے اہم کام چھوڑ کر ریڈیو سٹ کے پاس جم کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کے پیچھے بھی ایک راز ہے۔ جو کل تین بجے بلکہ پونے چار بجے شام مجھے ان کے ایک دوست نے بتایا۔ راز واز کیا ایک عام سی بات ہے کہ سید لطف علی صاحب کو اپنی خالہ زاد لڑکی آنسہ ساجدہ سے الفت

ہو گئی ہے اور چونکہ لطف علی صاحب کی والدہ اور ساجدہ کی والدہ میں شدید لڑائی ہے۔ اس لئے لطف علی صاحب ساجدہ کے گھر یا ساجدہ لطف علی کے گھر آجا نہیں سکتی۔ بلکہ ان کا پرندہ اس کے گھر یا اس کا پرندہ ان کے گھر پر پر نہیں مار سکتا۔ اب واردات قلبی یا ماجرائے دردِ دل ایک دوسرے کو سنانے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے۔ اور وہ ہے ریڈیو کا فرمائشی پروگرام۔

چنانچہ ایک ہفتہ سید لطف علی کی پسند کا ریکارڈ فلاں اسٹیشن سے بجایا گیا۔

تم ہی نے مجھ کو پریم سکھایا

ساجدہ بڑی ذہین لڑکی ہے۔ چنانچہ وہ سمجھ گئی کہ سید لطف علی کا وہ "تم" کون ہے۔ اس لئے اس نے لطف علی سے پہلی ملاقات اور ان کی پہلی نظر کے تاثرات کے اظہار کے لئے دوسرے ہفتہ کے فرمائشی پروگرام سے یہ ریکارڈ بجوایا،

لگا پہلی نظر کا تیر رے
اللہ۔ پہلی نظر کا تیر

تیسرے ہفتہ لطف علی کا ریکارڈ بجا

ترا جلوہ جس نے دیکھا
دیوانہ ہو گیا مستانہ ہو گیا

چوتھے ہفتے ساجدہ کی فرمائش یوں پوری ہوئی ے

میں ان کی بجاؤں رے میں ان کی بن جاؤں رے

پانچواں ہفتہ لطف علی نے شبہ کو یقین میں بدلنا چاہا۔

کہیں دھوکا نہ دینا ہمیں
نہ افسانہ ہم کو بنانا

چھٹے ہفتے ساجدہ نے یقین دلایا

یہ افسانہ نہیں ظالم مرے دل کی حقیقت ہے
مجھے تم سے محبت ہے، مجھے تم سے محبت ہے
ہم تمہارے ہو چکے
تم ہمارے ہو نہ ہو

آٹھویں ہفتہ ساجدہ نے وعدہ لینا چاہا۔

دل دھڑکے، آنکھ موری پھڑکے
چلے جانا نہ دیکھو جی بچھڑ کے

نویں ہفتے لطف علی نے وعدہ وعید کی اس فضول بحث میں پڑنے کی بجائے محبت کئے جانے اور کئے جاتے رہنے کا مشورہ دیا کہ محبت ہی عین حیات ہے۔

محبت کی بندی محبت کئے جا

مگر ساجدہ آخر کو عورت ذات تھی۔ اس نے دسویں ہفتہ انہیں اس طرح دعوتِ ملاقات دی تاکہ معاملہ پختہ ہو جائے۔

"ہماری گلی آنا۔ اچھا جی!"

چنانچہ گیارھویں ہفتے لطف علی نے اپنا سابقہ سکونتی مکان تبدیل کر کے ساجدہ کو اطلاع دی۔

"گھر ہم نے لے لیا ہے ترے گھر کے سامنے"

مگر ان کی خالہ کو جیسے ہی لطف علی کی اس "حرکتِ ناہنجار" کا پتہ چلا تو اُس نے اپنی ساجدہ کو مکان کے پچھواڑے کے ایک کمرے میں یعنی (CELL) سیل میں ڈال دیا۔ اب تین چار ہفتوں تک میر لطف علی کی پسند کے حسب ذیل ریکارڈ بجتے رہے۔

۱۔ اٹھ سجنی کھول کواڑے

تیرا ساجن آیا دوارے

۲۔ دنیا میری جواں ہے۔

آباد تو کہاں ہے

آ رات جا رہی ہے

۳۔ ہائے کس بت کی محبت میں گرفتار ہوئے

۴۔ ذرا نینوں سے نینا ملائے جاؤ رے

مورے بانکے رسیلے سنوریا

مگر صد حیف اور ہزار افسوس کہ ساری اطلاعیں اور التجائیں "صرف ہوا" ہو کر رہ گئیں۔ ادھر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس کے سولھویں ہفتے غیر متوقع طور پر ساجدہ کی پسند کا ایک ریکارڈ بجا۔

ساسوں کے گھر سے آئی ہیں۔ ہاں آئی ہیں

گوری سونے کی چوڑیاں

اب لطف علی کو پتہ چلا کہ کچھ گڑ بڑ ہو گئی ہے یعنی ساجدہ کی شادی طے پائی ہے۔ اور وہ بھی کسی امیر آدمی کے ساتھ جس کی ماں نے دلہن کے لئے سونے کی چوڑیاں بھیجی ہیں۔

لطف علی صاحب کو بڑا غصہ آیا اور انہوں نے سترھویں ہفتہ اس ریکارڈ کی فرمائش کر دی ؎

یہاں بدلا وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے۔

ساجدہ نے اٹھارھویں ہفتہ اس ریکارڈ کے ذریعہ صورتِ حال سے آگاہ کیا ؎

مجبور ہوں میں عورت ہوں
بولو ساجن کیا کروں کیا کروں

لطف علی نے اس ریکارڈ کے ذریعہ مشورہ دیا۔

مار کٹاری مرجانا
پی کے زہر مرجانا

ساجدہ دو ہفتے تک اس مشورہ پر غور کرتی رہی اور لطف علی صاحب کو یقین آ گیا کہ یا تو کٹاری چل گئی یا زہر اپنا کام کر گیا۔ لیکن بائیسویں ہفتہ ساجدہ کی ہمراز سہیلی سلطانہ کی پسند کا ریکارڈ بجایا گیا۔

گوری چلی پیا کے دیس

یعنی معاملہ بقول پنجابیوں کے "گڑبڑ" ہو گیا۔ یعنی ساجدہ کی شادی خانہ آبادی بخیر و خوبی انجام پا گئی اور ساجدہ اب پیا کے دیس جا رہی ہے

اور اب سامنے بیابان ہی بیابان ہے

لطف علی نے تیئیسویں ہفتہ اپنا یہ ریکارڈ لگایا۔

محمل کو ذرا روکو سن لو مرا افسانہ

چوبیسویں ہفتے ساجدہ نے تلقینِ صبر کی یعنی

محمل نہیں رک سکتا، اب صبر کرو پیارے

پچیسویں ہفتہ لطف علی کا آخری فرمائشی ریکارڈ بجا۔

اے کاتبِ تقدیر مجھے اتنا بتا دے

چھبیسویں ہفتے ساجدہ بیگم کا آخری فرمائشی ریکارڈ لطف علی صاحب کو یہ پیغامِ جدائی دے گیا۔

ہمیں تو شامِ غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی

یہ تو تھی سید لطف علی اور ساجدہ بیگم کی ریڈیائی محبت کی پُر بہار ہفتوں والی داستان — آج کل سید لطف علی اور ساجدہ بیگم کی دونوں کی زندگی بڑی تلخ، غم آلود اور اداس ہے مگر اس کے باوجود اب بھی ریکارڈوں کا فرمائشی پروگرام ہی ان کے زخموں پر مرہم اور نمک چھڑکتا ہے۔ کبھی کسی پروگرام میں ریکارڈ کہتے ہیں

۱۔ دو دلوں کو یہ دنیا ملنے ہی نہیں دیتی۔

۲۔ چاہ برباد کرے گی ہمیں معلوم نہ تھا۔

۳۔پہلے جو محبت سے انکار کیا ہوتا۔

۴۔ہائے ہائے یہ ظالم زمانہ

تو ان دونوں کشتگانِ رہ اُلفت کے دلوں سے ٹھنڈی آہیں نکلتی ہیں اور اس طرح صبح ہوتی ہے۔ شام ہوتی ہے۔ اسی طرح ساجدہ کسی دن مرجائے گی اور کسی دن سید لطف علی مرجائیں گے اور دنیا سے ایک فرہاد اور ایک شیریں کم ہوجائیں گے مگر ریڈیو بجتا ہی رہے گا اور ہر جمعرات دس بجے شب اناؤنسر اعلان کریں گے۔

"آپ کی پسند"

آپ کی پسند کے پروگرام کے سلسلہ میں فرمائش کرنے والی یا کرنے والوں کے کرداروں کے نفسیاتی تجربوں کے بارے میں میں نے ابھی ایک ہلکا سا اشارہ کیا تھا کہ بیچ میں سید لطف علی صاحب ٹپک پڑے۔ اس لئے بات جہاں کی تہاں رہ گئی تھی۔ اب جب کہ سید صاحب موصوف تشریف لے جاچکے ہیں۔ اس لئے میں اشارے کو واضح طور پر واضح کردینا چاہتا ہوں (کہ یہ میرا قومی فرض ہے) میرے دوست فرید احمد فاروقی جن سے میں ابھی ابھی آپ کو ملا چکا ہوں۔ وہ آج کل ایسے ہی نفسیاتی تجزیوں میں بُری طرح شب و روز مصروف ہیں۔ اتنے مصروف کہ صرف کبھی سر کھجانے کی فرصت ملتی ہے۔ ان کی تازہ ترین کتاب "ریڈیو کی فرمائشی موسیقی کی نفسیات" جلد اوّل سے تجربات اخذ کرکے پبلک کے فائدے کے لئے یہاں درج کرتا ہوں۔ بلکہ اس سے پہلے تو میں آپ کو اس کتاب کا صفحہ ۵۲ دکھاتا ہوں جو اس کتاب کی جان ہے۔ صفحہ ۵۲

پر فرید صاحب نے بڑے دلچسپ خط کا عکس شائع کیا ہے۔ وہ خط قارئین اور ناظرین کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ ذیل میں ہو بہو لفظ بہ لفظ نقل کیا ہے۔ گستاخی معاف اور مخفی مبادکہ یہ خط کسی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر کے نام لکھا گیا تھا جسے فرید صاحب نے حاصل فرمایا اور جذبات ریڈیو اسٹیشن لنڈی کوتل شائع کیا۔

وہ خط یہ ہے۔

از لاہور۔ گوالمنڈی۔ مورخہ ۱۱ر دسمبر

جناب مینجر صاحب ریڈیو اسٹیشن لنڈی کوتل۔

بعد دعا سلام وتسلیمات واضح ہو کہ ہم تم یہاں خیریت سے رہ کر آپ کی خیریت بدرگاہ والٰہی نیک چاہتے ہیں۔ دیگر کیفیت یہ ہے کہ ہم حسب ذیل تابعدار لوگوں کی فرمائش کے مندرجۂ ذیل ریکارڈ بجائیں تو ہم جمعرات کی رات دس بجے اپنے محمد خواجہ صاحب امرتسری کی ہوٹل خوش لذیذ ہوٹل میں بیٹھ کر سنیں گے اور آپ کے اور آپ کے بال بچوں کے حق میں دعا گو رہیں گے

اب نمبر واری فرمائشات درج ہیں۔

۱۔ میری فرمائش

دھیرے چل دھیرے چل او تانگے والے دھیرے چل

۲۔ چراغ دین حلوائی کی فرمائش

دہی والی ہماری گلی آئیو۔

۳۔ کریم خاں بمبئی سے دلہن لایا رے۔

میں تو بمبئی سے دلہن لایا رے۔

۴۔ کھلونے والے بابو خاں کی پسند

یہ جگ ہے گڑیوں کا کھیل

۵۔ پہلوان قادر بخش کی فرمائش

آنا میری جان سنڈے کے سنڈے

اور اپنا ناچنے والا بھاٹیا بھی ریکارڈ سننے کا شوق رکھتا ہے۔ اس کا یہ ریکارڈ بجائیں۔

چنا جور گرم بابو میں لایا مزے دار

اور رام گوپال ملز کا مزدور بھائی بولتا ہے۔ یہ ریکارڈ لگاؤ۔

کیوں خون غریبوں کا بہاتی ہے امیری

اور یہ خواجہ صاحب کے ہوٹل کا چھوکرا شیرا بولتا ہے اس ریکارڈ کے بارے میں۔

کیا جانے امیری جو غریبی میں مزا ہے

بہت فرمائشات ہو گئی ہیں مگر ہمارے استاد فتو خاں کا لونڈا مجو بہت ضد کر رہا ہے کہ اس کی پسند کے ریکارڈ کے لئے بھی دو چار حروف آپ کو لکھا دوں۔ ہم نے اسے بہت سمجھایا کہ منیجر صاحب بچارے بڑے آدمی ہیں وہ تجھ جیسے لونڈے کی فرمائش کیسے پوری کریں گے۔ وہ مانتا ہی نہیں ہے چلئے جی اس کی پسند کا بھی ریکارڈ بجا ہی دیجئے۔ بچہ آدمی ہے خوش ہو جائے گا اور آپ کے بچوں کو دعا دے گا۔ الغرض اس کی پسند کا یہ ریکارڈ ہے۔

بوٹ کروں میں پالش بابا بوٹ کروں میں پالش

اچھا جی منیجر صاحب اتنی سی فرمائشیں ہیں۔ آئندہ اور بھی کی جائیں گی جب تک آپ سلامت ہم سلامت تو پھر ریڈیو اسٹیشن بھی سلامت۔ اس جمعرات کو ہم سب یار دوست خواجہ صاحب کی ہوٹل میں ضرور جمع ہونگے اور اپنا اپنا نام اور اپنا اپنا ریکارڈ سننے کے لئے بیتاب رہیں گے۔

ہماری طرف سے وہ ریکارڈ لگانے والے بھیا جی کو بہت بہت سلام اور دعا اور آپ کو جزائے خیر اور نیک توفیق۔ فقط

آپ کا تابعدار

سردار محمد

"تانگہ والا تانگہ نمبر (۱۶۷) گوالمنڈی چوک۔

لاہور شہر

نوٹ:۔ خط کے جواب کے لئے چارپائی بھیج رہا ہوں۔ جواب ضرور دیں اور کار لائقہ سے یاد فرمائیں۔

اس دلچسپ خبط کو جو خط بھی ہے اور نفسیاتی تجزیوں کا ایک مجموعہ بھی بغیر تنقید و تبصرہ کے ویسے ہی چھوڑ کر فاضل مصنّف نے دوسرے نفسیاتی تجزیوں کے حسبِ ذیل نتائج پیش کئے ہیں۔ صفحہ ۴۸ پر وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

میرٹھ کی مسماۃ رادھا کماری غالباً نوشگفتہ جوانی ہے۔ اس نے آل انڈیا ریڈیو نمبر ۲ سے بتاریخ ۱۸ جولائی اور بتاریخ ۱۲ اکتوبر حسب ذیل ریکارڈوں کی فرمائش کی۔

"جیا لہرائے۔ آئی جوانی"

کرلو محبت۔ کرلو محبت"

لڑکی بہت ہی نوعمر اور ناتجربہ کار معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ نہیں جانتی کہ محبت کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے اور پھر محبت کرنی سرجیکل آپریشن تو نہیں ہے کہ کی جائے۔

دوسرا تجزیہ ۱۴ مارچ کے پروگرام میں کسی محمد سلطان کی پسند کا یہ ریکارڈ بجایا گیا تھا۔

"جیون آشا یہ ہے میری"

"نام ہے اس کا مداتی۔ سارا خزانہ یہ ہے"

اس ریکارڈ کے بول سے شخصیت یوں واضح ہوتی ہے کہ یا تو وہ کوئی بے روزگار گریجویٹ ہے یا مشرقی پنجاب کا مہاجر جس کے پاس صرف ایک دونی رہ گئی ہے۔

تیسرا تجزیہ۔

۸ جنوری کو آل انڈیا ریڈیو نمبر ۲ سے کسی فہمیدہ خاتون نے آگرہ سے فرمائش کی تھی۔

"ابھی تو میں جوان ہوں"

یہ فہمیدہ خاتون غالباً نوجوان بیوہ ہے جس کے خیالات کی ترجمانی اس ریکارڈ نے کی۔ وہ غالباً عقدِ بکر یا نکاح ثانی کی خواہش مند ہے۔

پچھلے ہفتہ فلاں ریڈیو اسٹیشن سے کسی گلاب بائی کی پسند کا یہ ریکارڈ بجایا

گیا۔

"مورے جوبنا کا دیکھو ابھار
پاپی جوبنا کا دیکھو ابھار"

یہ گلاب بائی ضرور کوئی عصمت فروش عورت ہے اور ریڈیو کے فرمائشی پروگرام کو ذریعہ اشتہار کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہے۔ اوّل تو یہ ریکارڈ ہی بڑا فحش ہے۔ چاہے اس کا گیت حضرت جوش ملیح آبادی کے فکر کا نتیجہ ہی کیوں نہ ہو، ہے تو مخرب اخلاق کسی ریڈیو اسٹیشن سے اس ریکارڈ کو نہ بجنا چاہیئے اور نہ کسی ریڈیو کو کسی ایک شخص کا ذاتی پروپگنڈہ کرنا چاہیئے۔

پانچواں تجزیہ:۔

پانچواں تجزیہ سیاسی رنگ کا حامل ہے۔ ۱۵ر اگست ۴۷ء کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے ہر ریڈیو اسٹیشن سے متعدد بار متعدد لوگوں کی فرمائش پر بجایا گیا۔ اور وہ ریکارڈ یہ تھا۔

"جب ہم یہاں اور تم وہاں
کیسے بجے گی بانسری۔"

اس ریکارڈ کی فرمائش میں کسی شخص واحد یا صرف دو اشخاص کی داستانِ جدائی مضمر نہیں بلکہ دو ملکوں دو قوموں۔ دو تہذیبوں اور دو محبتوں کی جدائی کی داستان ہے۔ اور یہ ریکارڈ عرصۂ دراز تک ہدف فرمائش بنا رہے گا، جب تک دونوں ممالک کے مابین دونوں قوموں کے مابین خوشگوار تعلقات نہیں ہو جاتے۔ جب تک نفرت کی جگہ محبت نہیں لے لیتی۔ دونوں ممالک کے

غریب عوام اپنے لیڈروں سے پوچھتے رہیں گے بولو۔

"کیسے بجے گی بانسری"

انگریزوں اور دیسی سرمایہ داروں نے وہ بانسری توڑ ڈالی اور نغمہ کو مار ڈالا۔ اب نغمہ مر چکا ہے۔ لیکن اگر دونوں ملکوں کے عوام جاگ اٹھیں۔ دونوں ملکوں کے عوام انسانیت کا پرچم لے کر آگے بڑھیں تو ممکن ہے کہ بانسری کا چھٹا ہوا نغمہ واپس مل جائے۔ پھر نغمہ جاگ اُٹھے۔ پھر زندہ ہو جائے۔ پھر ہماری روحوں میں گونجنے لگے۔ پھر عوامی ہندوستان اور عوامی پاکستان جنم لیں گے۔ اس وقت فرمائشی پروگرام میں کیسے کیسے ریکارڈ بجیں گے۔ ہائے ہائے کچھ نہ پوچھو۔

ریڈیو پر فرمائشی پروگرام سننے والوں کے نفسیاتی تجزیوں پر یہ کتاب مصنفہ فرید احمد فاروقی بڑی جامع بڑی مدلل اور بڑی "وہ" ہے۔ کم از کم اردو ادب میں اس سے پہلے اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ کتابیں لکھنے والوں نے یوں تو "استاد باورچی خانہ۔ فن مرغ بازی" "رہبر ہارمونیم" "کرو شیا استانی" جیسی معرکۃ آلارا کتابیں لکھی ہیں۔ مگر یہ کتاب تو بس "چیزے دیگری" ہے۔ اس موضوع پر تصنیف کرنے کا سہرا مسٹر فرید احمد فاروقی کے سر پہ ان کی شادی کے سہرے سے بھی پہلے باندھا گیا تھا۔ کتاب آپ کے شہر کے ہر کتب فروش کے پاس مل سکتی تھی۔ مگر افسوس کہ پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت سارا اسٹاک ضبط کر لیا گیا۔ پھر بھی ہم مسٹر فرید احمد فاروقی کی خدمت میں ہدیہ تہنیت پیش کرتے ہیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بدنصیب

ملک میں بعض ایسے بھی لوگ ہیں۔ جن کے فرمائشی ریکارڈ کا اُن کے شخصی کردار سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً ابھی پچھلے ہفتہ مالیر کوٹلہ ریڈیو اسٹیشن سے آپ کی پسند کے پروگرام میں کسی مسٹر ابراہیم جلیس بی۔ اے علیگ کی پسند کا یہ ریکارڈ بجایا گیا۔

سخی کی خیر مائی بابا کی خیر تیرا اللہ نگہبان ہو
تیرا اللہ نگہبان ہو۔ ترا مولیٰ نگہبان ہو
سخی کی خیر ہو بابا کی خیر

اور تمت بالخیر

نوٹ:۔ مضمون تمام ہوا۔ مصنّف بصد عجز و انکساری قارئین سے گزارش کرتا ہے کہ جو بھی صاحب اس مضمون کا ترجمہ سنسکرت اور لاطینی زبان میں کرنا چاہیں۔ وہ مصنف سے پہلے سنسکرت اور لاطینی زبان سیکھ لیں۔ ورنہ ترجمہ مسروقہ سمجھا جائے گا۔

پھر نوٹ:۔ یہ مضمون باجازت ریڈیو اسٹیشن مالیر کوٹلہ عنقریب براڈ کاسٹ ہوگا۔

اور پھر ایک نوٹ:۔ اس مضمون کی تیاری میں بے شمار فلمی گانوں کی ایک آنہ ایڈیشن والی سیریز سے (جو ہر سینما ہال کے باہر ہر شو کے ختم کے بعد ہر بک سیلر لونڈے سے بآسانی دستیاب ہو سکتی ہے) بے تحاشا مدد لی گئی ہے۔

آخری نوٹ:۔ مضمون پڑھ کر مدیر رسالہ کی معرفت خاکسار مصنف

کو تعریفی خطوط لکھے جائیں تاکہ یہ خاکسار مصنف خوش رہے اور آئندہ ہفتے
کے فرمائشی پروگرام میں یہ ریکارڈ لگوائے :۔

"ہم سے خوش ہے زمانہ
آں آں ...."

پردۂ سیمیں پر

میری زندگی سب سے بڑی حسرت یہ ہے کہ میں کوئی نئی فلم دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ کوئی سخن سازی نہیں ہے بلکہ امرِ واقعہ ہے کہ پچھلے دس سال سے میرے دل میں یہ حسرت کچھ ایسی رس بس گئی ہے کہ اگر آپ میرا سینہ چیر کر دیکھیں تو آپ کو میرا دل نہیں ملے گا بلکہ حسرت ملے گی۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ پچھلے دس سال سے میں ایک ہی فلم بار بار دیکھ رہا ہوں۔ ان میں نیا پن اگر کچھ ہوتا ہے تو نام کا صرف نام کا۔ وہی ایک فلم جسے میں دس سال سے دیکھ رہا ہوں۔ اس کا نام کبھی بندھن ہے تو کبھی قسمت۔ کبھی رتن ہے تو کبھی چھمیاں۔ ہیرو کبھی اشوک کمار ہوتا ہے۔ تو کبھی کے ایل سہگل اور کبھی موتی لال ہوتا ہے تو کبھی پرتھوی راج۔ ہیروئن کبھی پری چہرہ نسیم ہوتی ہے تو کبھی پُر اسرار نینا، کبھی حورِ شمائل وینا ہیروئن بن کر پردۂ سیمیں پر جلوہ فگن ہوتی ہے۔ کبھی آہو چشم مہتاب ہیروئن کا روپ دھارے نظر

آتی ہے۔کبھی سدا بہار خورشید ہیروئن بنی نظر آتی ہے۔

توکبھی بلبلِ بنگال کانن بالا ہیروئن کا رول انجام دیتی ہے

مگر فلم وہی ہے —— وہی پرانی فلم —— وہی کہانی —— ایک نوجوان لڑکا، ایک نوجوان لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک رقیب حائل ہوجاتا ہے۔رقیب فلم کے آخری سین تک عاشق و معشوق کو تنگ کرتا ہے۔ اور آخری سین میں اپنی شادی کے سارے انتظامات طے کر کے اپنی جگہ اصلی عاشق کو بٹھا کر خود اوورکوٹ پہن سگریٹ پیتا ہوا جنگل کی سمت نکل جاتا ہے۔ ہیروئن دولھا کی جگہ اپنے اصلی عاشق کو دیکھ کر گھونگھٹ کے اندر شرماتی ہے لجاتی ہے۔اور ہم آپ سینماہال کے باہر گھر جانے کے لئے تانگہ یا ٹیکسی تلاش کرتے ہیں۔

دوسری خصوصیت جو سارے فلموں کی جان ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ غریب اور امیر کی لڑائی —— یا افلاس اور امارت کی ٹکر —— شروع سے آخر تک یہ لڑائی یا یہ ٹکر جاری رہتی ہے۔آخر میں غریب اور اس کی غریبی کی فتح ہوتی ہے اور امیر کو شکست ہوتی ہے وُہ ذلیل ہوتا ہے۔سینماہال کی پبلک استہزائی سیٹیاں اور طنزیہ قہقہے سنتا ہے۔ ان کی گالیاں کھاتا ہے اور پردۂ سیمیں سر پہ پیر رکھ کر یا پیر رکھ کر بھاگ جاتا ہے۔

رومانوی فلمیں

گزشتہ دس سال سے پردۂ سیمیں پر جو فلمیں پیش کی جا رہی ہیں۔

ان میں بیشتر فلمیں رومانوی ہوتی ہیں یعنی عشق و محبت کی (LOVE) کہانیاں جو عموماً حسب ذیل طریقوں سے شروع ہوتی ہیں۔ آیئے اپنے شہر کے سینما ہال میں کچھ دیر بیٹھیں۔ سینما ہال کے آپریٹر نے ٹھیک ساڑھے چھ بجے ہال میں اندھیرا پھیلا دیا — وہ اندھیرا جو عاشقوں کے شب ہجر کی طرح تاریک ہے جو شب دیجور کی طرح بھیانک ہے۔ مگر اچانک اس اندھیرے میں آپ کے سروں پر جیسے رنگ و نور کا ایک "خط قزح" تن جاتا ہے اور آپ پردۂ سیمیں پر کچھ دیر تک شہر کے مشہور درزیوں، بسکٹ فیکٹریوں اور عطائی حکیموں، محکمہ رسد اور میونسپلٹی کی آیتوں، حسن بخش صابونوں، ترقی پسند کتابوں، خوشبو دار تیلوں، بونا فائیڈ بھی ہوں، ہر قسم کے سگریٹوں اور آنے والی فلموں کے رنگ برنگے سلائیڈ دیکھتے ہیں۔ پھر اس کے بعد معاً موسیقی کے سُر بلند ہوتے ہیں اور پردۂ سیمیں پر ہندوستانی فلم کا انگریزی نام یوں نمودار ہوتا ہے۔

اٹ از اے نٹ کھٹ آرٹ کنسرنس پکچر

چھپن چھری فرسٹ آف جان پری

اسٹوری اینڈ ڈائیلاگ — بائی جاہل ہوشیار پوری

فوٹوگرافی	بائی	بی این گھاڈکے
میوزک	بائی	آر۔ بی۔ باٹلے

ڈائریکٹر

بابو رام میڈھے

فلم اگر شہری زندگی سے متعلق ہو تو یوں شروع ہوتی ہے۔

ایک بہت بڑے شہر کی بہت بڑی شاہراہ۔ موٹروں۔ بسوں۔ ٹراموں وکٹوریہ گاڑیوں اور آدمیوں کا ایک سیلِ رواں ہے جو بہا جا رہا ہے۔ اس ہجوم میں آپ کو ایک جگہ لیلا چٹنس بھی نظر آتی ہے۔ جو بڑی زرق برق ساڑھی پہنے سڑک پر سے چلی جا رہی ہے۔

اچانک پیچھے سے ایک تیز موٹر آتی نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہال میں بیٹھے ہوئے سارے تماشائیوں کو روند کر نکل جائے گی۔ لیکن چونکہ وہ فلمی موٹر ہے۔ اس لئے صرف لیلا چٹنس کو روندنا چاہتی ہے۔ آپ کو نہیں۔ پھر اچانک موٹر لیلا چٹنس کے قریب آ جاتی ہے۔ لیلا چٹنس گھبرا کر اس زور کی چیخ مارتی ہے کہ ہال میں بیٹھے ہوئے سارے تماشائیوں کے کلیجے دہل جاتے ہیں اور تماشابیں عورتیں تو ڈر کر آنکھیں میچ لیتی ہیں اور سارے ہال میں ایک تجسّس آفریں سناٹا چھا جاتا ہے ـــــ مگر صاحب جب تک اشوک کمار فٹ پاتھ پر کھڑا ہے کیا مجال ہے۔ کہ اس فلمی موٹر کی جو وہ لیلا چٹنس کو کوئی گزند پہنچائے یا نظر بد سے دیکھے ـــ ڈائرکٹر اشوک کمار کی پیٹھ میں ایک ٹھونکا دیتا ہے اور اشوک کمار بجلی کی طرح کوندتا ہے اور لیلا چٹنس کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیتا ہے۔ بیچاری فلمی موٹر ناکام و نامراد غصّے سے غراتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے۔ تماشابیں عورتوں کی جان میں جان آتی ہے اور مرد تماشائی خوشی سے زور زور کی تالیاں اور سیٹیاں بجاتے ہیں۔ لیکن لیلا چٹنس چونکہ بیہوش ہے۔ پبلک کی اس مسرّت بردوش شور و غوغے سے لطف انداز سے لیٹی ہے۔ جیسے اپنے بڈروم کے پلنگ پر ـــــ اسی لئے وہ کروٹ لینا چاہتی ہے۔ لیکن اشوک کمار

کی باہیں کوئی سچ مچ کا پلنگ تو نہیں ہیں۔ کہ لیلا چٹنس کروٹ لے سکے چنانچہ کروٹ لینے کی کوشش میں اس کی آنکھ کھل جاتی ہے اور جب آنکھ کھل جاتی ہے تو لیلا چٹنس اپنی چشم میگوں اور میگسار سے مشاہدہ کرتی ہے نزیاں تو نہیں البتہ سود ہے۔ یعنی وہ ایک نوجوان کی باہنوں میں ہے ـــ

لیلا چٹنس مسرت سے پوچھتی ہے۔

"تم نے میری جان بچائی ہے۔ نوجوان تم کون ہو؟"

اشوک کمار انتہائی سادگی سے شرمیلے انداز میں جواب دیتا ہے ـــ

"شاموا!"

یہ سادگی، یہ شرمیلا انداز اور یہ پیارا پیارا سا نام سب مل کر محبت کا تیر بن جاتے ہیں۔ اور وہ تیر لیلا چٹنس کے ننھے سے دل میں ترازو ہو جاتا ہے، یعنی عام محبوباؤں کی طرح لیلا چٹنس کی نگاہیں ایک لمحے کے لئے مجوب انداز میں اشوک کمار کو دیکھتی ہیں اور شرم کے بوجھ سے اس کی غلافی پلکیں جھک جاتی ہیں۔ یہ پلکیں پھر ہمیشہ کے لئے جھک جاتی ہیں۔ یعنی محبت شروع ہو جاتی ہے اور تھرڈ کلاس سے پبلک شور مچاتی ہے۔ پبلک کا فیشن ہے کہ ہائے۔ ہائے۔

اور لیلا چٹنس فوراً سنبھل کر اشوک کمار سے کہتی ہے۔

"نوجوان۔ چونکہ تم نے میری جان بچائی ہے۔ اس لئے تم میرے گھر چل کر بسکٹ کھاؤ اور چائے پیو۔"

اشوک کمار کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ وہ دراصل ایک بے روزگار

گریجویٹ ہے۔ نوکری ڈھونڈنے شہر آیا تھا۔ لیکن نوکری نہ ملی لیلا چٹنس ملی زرق برق کپڑوں والی لیلا چٹنس۔ اسی لئے اشوک کمار کچھ ہچکچاتا ہے۔ لیکن لیلا چٹنس کچھ ایسی مدھ بھری نگاہوں سے اُسے دیکھتی ہے کہ اشوک کمار بھول جاتا ہے۔ کہ وُہ پھٹے حال خستہ حال اور تباہ حال ہے۔ بھوکا تو تھا ہی بسکٹ اور چائے کی دعوت اس کی آنکھوں میں گدگدی پیدا کر دیتی ہے اور وہ لیلا چٹنس کے عالی شان گھر جاتا ہے۔ لیلا چٹنس اسے ایک نرم صوفے پر بٹھا کر اندر چلی جاتی ہے۔ اشوک کمار پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس عالی شان گھر کی ہر عالی شان چیز کو دیکھتا ہے۔ اسی اثنا میں لیلا چٹنس اپنے عالی شان موٹے باپ کو بھی بُلالاتی ہے۔ اپنے اصلی باپ کو نہیں۔ اگر اصلی باپ ہو، تو اشوک کمار کا سر سلامت نہ رہے اور نہ اس دیدہ دلیری سے لیلا چٹنس ایک آوارہ نوجوان کو اپنے گھر لا سکے۔ چونکہ وہ لیلا چٹنس کا فلمی باپ ہے۔ اس لئے لیلا چٹنس بھی اُس سے وہی برتاؤ کرتی ہے جو ایک فلمی سعادت مند بیٹی کر سکتی ہے۔ (یہاں ایک بات میں آپ کو بتا ہی دوں، سارے فلمی باپ عموماً بہت موٹے ہوتے ہیں — ان کا ایک پیر سوجا ہوا ہوتا ہے۔ پردۂ سیمیں پہ وہ ہمیشہ دو عدد بغلی لکڑیوں کی مدد سے اِدھر اُدھر پھدکتے نظر آتے ہیں۔ یہ بڑے زن مرید ہوتے ہیں۔ یہ اپنی فلمی بیٹی سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں۔ جتنی کہ اس فلمی بیٹی کی ماں یعنی موصوف کی فلمی بیوی اپنی فلمی بیٹی سے ناراض رہتی ہے۔ کیونکہ فلمی بیٹی اس کے سُوجے ہوئے پاؤں کی ہمیشہ مرہم پٹی کرتی ہے اور ماں کے زخموں پر نمک چھڑکتی ہے۔ فلمی ماں کو اپنی فلمی بیٹی کی آزاد خیالی اور

آزادروی کبھی پسند نہیں ہوتی - مگر فلمی باپ ہمیشہ اپنی فلمی بیٹی کی آزادی کی سائیڈ لیتا ہے. یعنی طرف داری کرتا ہے - اور فلم چلتی رہتی ہے -

ہاں تو لیلا چٹنس اپنے باپ سے شامو یعنی اشوک کمار کا تعارف کراتی ہے - پھر تینوں مل کر بسکٹ کھاتے ہیں اور چائے پیتے ہیں. چائے پی کر فلمی باپ معنی خیز انداز میں کھانستا کھنکارتا مسکراتا اپنی فلمی بیٹی اور اشوک کمار کے لئے میدانِ عشق ہموار کرتا ہے اور اشوک کمار صاحب کو اپنے فلمی کارخانے کی مینجری عطا کرتا ہے - اب کیا ہے - وہی اشوک کمار صاحب جو پھٹے پُرانے کپڑوں سمیت نوکری ڈھونڈنے شہر تشریف لائے تھے وہ لیلا چٹنس کو بغل میں لئے ایک شاندار بالکونی میں کھڑے ہو کر گاتا گاتے ہیں -

آج موسم سلونا ــــــ سلونا رے

ہاں سلونا رے

ہاں ہاں بیروزگاری کے بعد ایک کارخانے کی مینجری مل جائے تو موسم سخت گرمی یا بھیانک خزاں کا ہو - ایک دم سلونا ہو جاتا ہے -

(۳)

شہری زندگی کی رومانٹک فلموں کی دوسری ابتدا میں کچھ ایسا ہوتا ہے - وہی بہت بڑے شہر کی بہت بڑی شاہراہ اور اس پر ایک بہت بڑی دوکان - جس کے ایک کونٹر پر ایک طرف مس خورشید کھڑی ہیں تو دوسری طرف ماسٹر موتی لال - دونوں ایک دوسرے سے ناواقف

شاپنگ کر رہے ہیں۔ دوکاندار دونوں کے ہاتھ میں دو پیکٹ دے دیتا ہے اور وہ دونوں اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہی دوسرے منظر میں اور آپ سب دیکھتے ہیں۔ دیکھتے ہیں اور بے تحاشا قہقہے لگاتے ہیں کہ ایک طرف موتی لال پتلون پہ بلاؤز پہنے کھڑا ہے اور دوسری طرف مس خورشید ہاتھ میں شیونگ اسٹک لئے اس کا مصرف سوچ رہی ہیں

تیسرے منظر میں وہ دونوں ایک دوسرے کا پیکٹ واپس کرنے ایک دوسرے کے گھر جاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور کہیں سے کیوپڈ آتا ہے اور دو عدد محبت کے تیر دونوں کے دلوں میں چبھوتا ہے۔ تیروں کی اس چبھن سے بلبلا کر وہ گانے لگتے ہیں۔

موتی لال صاحب فرماتے ہیں:۔

......محبت ہو گئی

خورشید جواب دیتی ہے۔

ہاں کہانی بن گئی۔

(۴)

رومانٹک فلموں کی تیسری ابتدا یوں ہوتی ہے۔ وہی بہت بڑے شہر کی بہت بڑی شاہراہ — ایک طرف سے مس رمولا سائیکل پر چلی آرہی ہیں دوسری طرف مسٹر نارنگ بھی تیز سائیکل پہ اڑے چلے آرہے ہیں۔ ایک موڑ پہ اچانک دونوں کی سائیکلیں ایک دوسرے

سے ٹکرا جاتی ہیں بس رمولا چونکہ بہت خوبصورت ہے۔ اس لئے انہیں بہت غصّہ آتا ہے اور وہ ماسٹر نارنگ کے موٹے گال پر ایک زوردار طمانچہ لگا دیتی ہے ــــ ہال میں پبلک ہنستی ہے اور پردۂ سیمیں پر مس رمولا دوبارہ سائیکل پر سوار بڑے میجسٹک انداز میں پیڈلنگ کرتی اپنا گلابی دوپٹہ فضا میں اڑاتی چلی جاتی ہیں۔ مگر ماسٹر نارنگ اس طرح افسوسناک حالت میں پڑے گال سہلاتے ہوئے بھگوان صاحب کو مطلع کرتے ہیں

"ہے بھگوان ــــ یہ میٹھا میٹھا طمانچہ تو عشق بن کر دل میں بیٹھ گیا ہے۔"

اس کے بعد وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اگلا پہیہ اپنی دونوں ٹانگوں میں پھنسا کر مڑا ہوا ہینڈل سیدھا کرتے ہیں اور اداس، ملول، محزون ومغموم سائیکل پر سوار ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی ہی دور جانے نہ پائے کہ سڑک پر ایک بگھی لڑھکتی ہے اور اس میں سے بہت موٹا رئیس آدمی سڑک پر گرا پڑا ہے۔ مسٹر نارنگ دوڑ کر اسے سنبھالتے ہیں اور موٹر ٹیکسی کے ذریعے اس کو اس کے گھر پہنچا دیتے ہیں۔ گھر پہنچ کر موٹا رئیس اس سے کہتا ہے۔

"نوجوان چونکہ تم نے میری جان بچائی ہے۔ اس لئے فلمی دستور کے مطابق تم بسکٹ کھاؤ اور چائے پیو۔"

مسٹر نارنگ صرف مسکرا کر اظہارِ رضامندی فرماتے ہیں اور مسٹر نارنگ ڈرائینگ روم میں لگی ہوئی فلمی تصویروں کو دیکھنے لگتے ہیں۔ اسی

اتنا میں مس رمولا باہر سے آتی ہیں اور ڈرائینگ روم میں نارنگ کو دیکھ کر ٹھٹک جاتی ہیں۔ اور بڑے غصہ سے استفسار فرماتی ہیں۔

" کیوں جی! کیا تم وہی غنڈے ہو جس نے آج میری سائیکل کو ٹکر دی تھی۔"

نارنگ انتہائی ہیروانہ انداز میں جواب دیتا ہے۔

" جی ہاں محترمہ" یہ سعادت سوائے ہیرو کے کسی اور ایکٹر کو تھوڑے ہی حاصل ہے۔

رمولا فیصلہ کُن لہجے میں کہتی ہے۔

" یہ بات ہے تو پھر تم بدمعاش ہو —— پھر میرے گھر کیوں آئے؟"

اب نارنگ صاحب ٹائی کی گرہ ٹھیک کر کے بڑے اکڑ کے جواب دیتے ہیں۔

" کیونکہ میں اس گھر کا مالک ہوں"۔

رمولا کا غصہ قابلِ دید ہے اور اس کا سوال قابلِ شنید۔

" تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے؟"

نارنگ اردو شاعری سے ایک مصرعہ اٹھا لیتا ہے۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

رمولا غصہ سے بے قابو ہو کر چیختی ہے۔

"نکل جاؤ یہاں سے غنڈے، بدمعاش، لوفر۔"

نارنگ اس وقت بڑے صبر و تحمل، بڑی ضبط و احتیاط اور بڑے

رومانی انداز میں مسکرا کر اردو شاعری سے ایک پورا شعر اٹھا لیتا ہے۔

ان کو آتا ہے پیار پہ غصّہ
ہم کو غصّہ پہ پیار آتا ہے

رمولا پیر پٹکتی ہے اور اندر جاتی ہے تاکہ نوکروں کو بلا لائے۔ دو سیکنڈ کے بعد اسی ڈرائینگ روم میں ایک دروازہ سے مس رمولا کا باپ معہ ایک نوکر اور چائے کی کشتی کے داخل ہوتا ہے اور دوسرے دروازے سے مس رمولا اور ایک درجن نوکروں کی بٹالین مارچ پاسٹ کرتی داخل ہوتی ہے۔ رمولا کا فلمی باپ رمولا کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہتا ہے۔

"اوہ بیٹی! تم آگئیں —— اچھا کیا --- چلو ان سے ملو۔ یہ آج نہ ہوتے تو تم یتیم ہو گئی ہوتیں بیٹی ——"

(یہاں ایک بات قابلِ غور ہے اور وہ قابل غور بات یہ ہے۔ ہندوستانی فلمی ہیرو ہمیشہ سے ہیروئن کے باپ کی جان بچاتے رہے ہیں۔ ایسی کبھی کوئی فلم نہیں بنائی گئی جس میں ہیرو نے ہیروئن کے دادا یا پردادا۔ نانا یا پرنانا کی جان بچائی ہو۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ اس جملہ معترضہ کے بعد) رمولا کی پلکیں جھک جاتی ہیں۔ یہاں میں آپ لوگوں سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں عورت کی پلکیں کب اور کیوں جھکتی ہیں؟

اس کے بعد دونوں چائے پیتے ہیں۔ چائے پیتے پیتے ماسٹر نارنگ سیب کے ایک آدھ ٹکڑے میں چھری چبھو دیتا ہے۔ یعنی دل میں

عشق کی چھُری چبھو دیتا ہے۔ ایک نارنگ پر ہی کیا موقوف —— ہمارے سب ہی ہندوستانی ہیرو سیب کے آدھے ٹکڑے میں چھریاں چبھونے میں بہت زیادہ مشاق ہیں۔

ادھر سیب کے آدھے ٹکڑے میں چھری چبھی اور اُدھر پس منظر میں طربیہ موسیقی کے سُر بلند ہوئے اور دوگانا شروع ہو گیا۔

مس رمولا	ساون کے نظارے ہیں
ماسٹر نارنگ	آہا آہا
مس رمولا	کلیوں کی آنکھوں میں
ماسٹر نارنگ	مستانہ اشارے ہیں۔
مس رمولا	آہا آہا

(۵)

ادھر پانچ چھ برسوں میں بعض فلم اسٹوری رائٹرز نے آغازِ محبت کے ان طریقوں سے بیزار ہو کر ایک جدت پیدا کرنے کی —— کوشش کی ہے۔ یعنی یہ کہ فلمی ہیرو جو بالعموم غریب آدمی ہوتا ہے۔ اور فلمی ہیروئن جو بالعموم مالدار عورت ہوتی ہے۔ ان دونوں میں محبت کسی حادثہ کی وجہ سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ ہیرو غریب آدمیوں کا لیڈر ہوتا ہے۔ غریب آدمیوں کے دکھوں، غموں اور بیچارگیوں کی اصالتاً یا وکالتاً نمائندگی کرتا ہے۔ ہیروئن کی ہیرو سے ٹکر نہیں ہوتی بلکہ ہیروئن ہیرو پر ترس کھاتی ہے اور یہ ترس کیا ہے؟ کیا ہے یہ ترس؟ —— یہ ترس محبت ہے —— ہاں صاحب

یہ ترس محبت ہے اور محبت بس ایسے ہی چپ چاپ شروع ہو جاتی ہے جیسے ساون کی جھڑی —— (یہاں یہ تشبیہ کچھ موزوں نہیں ہے مگر چونکہ غیر موزونیت بھی بعض اوقات جدت کا ثبوت ہے۔ اس لئے ساون کے نظارے ہیں آہا ہا)

(۶)

رومانوی فلموں کا ماحول اگر شہر کی بجائے دیہات ہو تو محبت کا آغاز یوں ہوتا ہے۔ ہیرو شہر سے خوب پڑھ لکھ کر یا بعض اوقات انگلستان کی تعلیم حاصل کر کے اپنے چھوٹے سے گاؤں میں آتا ہے۔ گاؤں ابھی دو تین کھیت دُور ہے کہ ایک شریر چنچل لڑکی ہیرو کے تانگے یا بیل گاڑی میں سے چپکے سے ہیرو کے میوے کی ٹوکری چرا لیتی ہے۔ ہیرو اس وقت گانے یا اونگھنے میں اتنا محو ہوتا ہے کہ اسے خبر ہی نہیں ہوتی۔ شریر لڑکی سارے میوے خود کھاتی ہے اور اوروں کو کھلاتی ہے اور چھلکے پھر سے ٹوکری میں بھر کر ٹوکری تانگے یا بیل گاڑی میں رکھنے جاتی ہے تو ہیرو اس کو پکڑ لیتا ہے۔ شریر لڑکی اس کا مُنہ چڑاتی ہے۔ چہلیں کرتی ہے۔ ہیرو اس وقت غصہ میں آجاتا ہے۔ مگر بوڑھا تانگے والا یا گاڑی بان ہنستے ہنستے کہتا ہے۔

"رمیش بابو —— یہ تو اپنی موسی شانتا بائی کی لڑکی رادھا ہی ہی ہی۔"

"رادھا؟ —— اوہ رادھا اتنی بڑی ہو گئی؟"

ہیرو کا یہ جملہ استعجابیہ دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ اوہ رادھا اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ میں اس سے بآسانی عشق کر سکتا ہوں۔ چنانچہ گھر پہنچ کر وہ اس سے ایک دم عشق کرنے لگتا ہے۔

فلم ڈائرکٹر

نظیر اکبر آبادی کے رنگ میں میرا ایک غیر موزوں شعر ہے۔

جو فلم دیکھتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور جو فلم بناتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یہ شعر کہنے کی خاص طور پر مجھے اس لئے ضرورت پیش آئی کہ بعض نازک مزاج شستہ مذاق فلم بین خواتین و حضرات فلم ڈائرکٹروں کو بالعموم آدمی سے بھی کمتر ہستی تصور کرتے ہیں۔ مثلاً اپنی زندگی کے کسی نہ کسی فلم کے بارے میں کسی نہ کسی شخص کی زبان سے آپ نے یہ جملہ ضرور سُنا ہوگا — کہ اوہ وہ فلم — اس کا ڈائرکٹر تو بس ...... معلوم ہوتا ہے۔

چونکہ یہ ریمارک صریح غلط ہے اور مشہور فلم ڈائرکٹر مسٹر دلیپ چند گپتا (یہ نام ظاہر بات ہے کہ بالکل فرضی ہے) میرے جگری دوست ہیں اور آدمی ہیں۔ صد فی صد آدمی ہیں۔ سو بہ سو آدمی ہیں۔ اسی لئے مجھے نظیر اکبرآبادی

کے رنگ میں ایک شعر ناموزوں کرنے اور یہ تردیدی مضمون لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ تاکہ سند رہے اور عندالضرورت کام آئے۔

اب بعد سلام و تسلیمات واضح ہو کہ مسٹر دلیپ چندر گپتا نہ صرف آدمی ہیں بلکہ قابل ترین ڈائرکٹر ہیں۔ جس کے لئے بقول شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال۔ نرگس ہزاروں سال تک چمن میں روتی رہی۔ تب کہیں مسٹر دلیپ چندر گپتا ماسٹر وٹھل کے عشق میں پڑھنا لکھنا چھوڑ والدین کو داغ فراق دے بہت نو عمری کے عالم میں کاٹھیاواڑ سے بمبئی تشریف لائے۔ جس وقت وہ بمبئی تشریف لائے۔ اس وقت ان کا حلیہ کیسا تھا۔ ماسوائے ماسٹر وٹھل کے کوئی نہیں بتا سکتا۔

البتہ ان کا حالیہ حلیہ یہ ہے۔ درمیانہ قد ۵½ × ۳۳، رنگ براؤن دبلا ڈیل، متناسب ڈول ہنس مکھ، ہیچک رو، ہونٹ میری طرح موٹے آنکھیں میری طرح کرنجی۔ گال بھرے بھرے، نظر دلاری۔ ادا ہنسنے کی پیاری سی۔ جب تک فلم ڈائرکٹر نہ بنے تھے۔ اس وقت تک دھاری دار لمبا کرتہ۔ دھوتی، سیاہ رنگ کی کشتی ٹوپی۔ لیکن جب سے ڈائرکٹر بنے ہیں۔ اس وقت سے سفید پتلون اور کالا مارہ داڑی ڈیزائن کا کوٹ پہنتے ہیں۔ البتہ اب ٹوپی اوڑھنا انہوں نے ترک کر دیا ہے۔ تہوار یا شوٹنگ کے وقت ایک سبز رنگ کا بوشرٹ بھی پہنتے ہیں۔ مگر بقول نور محمد صاحب چارلی۔ ہمیشہ نہیں کبھو۔ کبھو۔

مسٹر گپتا کی علمی قابلیت اور فنی استعداد کے بارے میں اکثر لوگوں نے

مجھ سے استفسارات کئے۔ حتیٰ کہ ایک دن خود میں نے گپتا سے پوچھا۔ تو انہوں نے بڑے ٹھنڈے سے لہجے میں فرمایا۔

"ابھی ادھر ہم کو علم کی کیا جرورت ہے۔ بھگوان نے ادھر ہم کو مگز دیا ہے اس کی کرپا سے سالا ہم سنے بیس پر چار فلم ڈائرکٹ کیا اور سالا سب ہٹ (HIT) ہو گیا۔"

یہ ایک حقیقت ہے کہ بھگوان نے مسٹر گپتا کو مغز دیا ہے اور اس کی کرپا ان کی چوبیس کی چوبیس فلمیں جس جس سینما میں گئیں۔ کئی کئی پُر بہار ہفتے گزار کر آئی ہیں اور اکثر شہروں میں تو ان کی بعض فلموں کی سلور جوبلیاں بھی منائی گئیں۔

اب آپ ہی فرمائیے۔ فلم ڈائرکٹر کے لئے تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے!۔ بھگوان نے جو مغز دیا ہے۔ وہ میں سمجھتا ہوں بہت کافی ہے۔ ویسے آج کل فلم انڈسٹری میں اچھے اچھے بی۔ اے، ایم، اے پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن بغیر ڈگری کے مسٹر گپتا کو فلم انڈسٹری کا کوئی بیس سالہ تجربہ ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے عرض کیا ہے کہ مسٹر گپتا نے انتہائی نوعمری کے عالم میں فلم لائن جوائن کی تھی:۔ تاریخ اور سن تو سوائے ماسٹر وٹھل کے کسی کو یاد نہیں۔ البتہ اتنا یاد ہے۔ کہ مسٹر گپتا چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے۔ سینما کے بہت شوقین تھے بالخصوص جب مسٹر وٹھل کی کوئی فلم آجاتی تو مسٹر گپتا تین تین چار چار بار اس فلم کو دیکھتے۔ ماسٹر وٹھل سے انہیں افلاطونی قسم کا عشق ہو گیا تھا۔ خدا بخش مولا بخش سینما فوٹو اینڈ بک سیلرز کے پاس سے انہوں نے ماسٹر وٹھل کی ایک درجن تصویریں خریدی تھیں۔ ان کی جیب، کتاب، میز۔ تکئے۔ البم کی آدھی رات کو

تلاش کیجئے اور آدھی رات کو ماسٹر وٹھل سے بھی مل لیجئے۔

بہر حال ماسٹر وٹھل کے عشق نے مسٹر گپتا کو کچھ ایسا وارفتہ کر دیا کہ مسٹر گپتا نے لکھنا پڑھنا چھوڑ ماں باپ کے ماتھوں پر کلنک کے ٹیکے لگائے تجوری میں سے روپے چرائے۔ بستر باندھ ریل گاڑی پر سوار ہوئے۔ بمبئی پہنچے اور ماسٹر وٹھل کے درشن کئے۔ ماسٹر وٹھل اپنے اس نوعمر پجاری کو دیکھ کر قہقہے لگاتا رہا۔ جب قہقہے ختم ہو گئے تو انہیں نظر ترحم سے دیکھا۔ جب ترحم تھک گئی تو انہیں اپنے گھر نوکر رکھ لیا۔

جس طرح گھر کا بھیدی لنکا ڈھا دیتا ہے۔ اسی طرح ہیرو کے گھر کا نوکر بھی فلم انڈسٹری ڈھا دیتا ہے۔ چنانچہ مسٹر گپتا نے بھی ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کئے۔ اس پکچر میں نوکر کا پارٹ کیا تو اس پکچر میں مسخرے کا رول سرانجام دیا۔ فلم "بادن بچھو" میں ڈاکٹر بن کر ہیروئن کے پردادا کی نبض دیکھی تو فلم "بلدے کا پھول" میں پولیس انسپکٹر بن کر رقیب کو گرفتار کیا۔

فلم دلارا ڈاکو میں قوالی کی ایک محفل میں تالیاں بجا رہے تھے تو فلم "توپ کا گولہ" میں دھوبیوں کے ساتھ ایک گھاٹ پر کپڑے دھوتے نظر آتے تھے

اسی طرح ان چھوٹے بڑے کاموں کے مسلسل بیس سالہ سنگین تجربات نے انہیں ایک دن فلم ڈائرکٹر بنا دیا۔ اس بیس سالہ ریاضت کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ان کی ڈائرکٹ کی ہوئی فلمیں جب کسی شہر میں دکھائی جائیں تو لوگ فلم کے نام اور فلم کی کاسٹ کو اتنی اہمیت نہیں دیتے جتنا کہ مسٹر گپتا کے نام کو اہم سمجھتے ہیں۔ چاہے فلم کا نام توپ کا گولہ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر اسے مسٹر گپتا نے

ڈائرکٹ کیا ہو تو پھر کچھ نہ پوچھئے۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ شہر میں کوئی توپ کا گولہ آگرا ہے اور لوگ پناہ لینے کے لئے سینما ہال کی طرف دوڑ رہے ہیں۔

اب میری یہ انتہائی خوش قسمتی ہے کہ آج کل مسٹر گپتا سے میرا دن رات کا واسطہ ہے۔ ہم دونوں چوبیس گھنٹوں میں روزانہ سات آٹھ گھنٹوں کے ساتھی اور رفیق ہیں۔ یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے۔ میں نے دیکھا کہ مسٹر گپتا سے ملنے کے لئے لوگ ترس ترس جاتے ہیں۔ ہر روز صبح اسٹوڈیو کے پھاٹک پر فلم کے شوقین۔ نوجوان اور خوبصورت لڑکیاں اور لڑکے دربان کی خوشامد کرتے ہیں۔ کہ بس ایک بار ڈائرکٹر صاحب سے ملا دو۔ مگر جس کی قسمت میں ان سے ملاقات کا شرف لکھا ہے۔ وہی ان سے مل سکتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک لعبتِ پنجاب، چندے آفتاب چندے ماہتاب، حسینانِ جہاں سے ایک انتخاب لاجواب تین روز تک مسٹر گپتا کے درشن کو ترستی رہی، مگر مسٹر گپتا کو فرصت ہی نہ ملی۔ اس کے بعد وہ لڑکی کہاں چلی گئی۔ کچھ پتہ نہ چلا۔ پتہ چلا تو صرف یہ کہ فلم ڈائرکٹر وہ ہستی ہے۔ جس کی جانب حسن خود کھنچا چلا آتا ہے۔ پنجاب کا جسم۔ بنگال کی زلفیں۔ لکھنؤ کا دہن گجرات کی کمر۔ حیدرآباد کی آنکھیں۔ یہ سب مسٹر دلیپ چندر گپتا کی ایک نگاہِ غلط انداز کے لئے ترستی رہتی ہیں۔ مگر مسٹر گپتا ہیں کہ ان کی طرف کنکھیوں سے بھی نہیں دیکھتے اور ایک میں ہوں کہ سدا خونِ جگر میں نے پیا ہے۔

مسٹر گپتا کہتے ہیں کہ بھگوان نے انہیں جو مغز دیا ہے۔ وہ مغز مجھے نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ کمپنی کے سیٹھ صاحب مجھ سے اتنے مرعوب نہیں جتنے مسٹر گپتا

سے مرعوب ہیں۔ سیٹھ صاحب کی نظروں میں میں نے ہمیشہ مسٹر گپتا کو گرانے کی کوشش کی ہے۔ مگر بھگوان کی کرپا سے میں مسٹر گپتا کا بال نہ بیکا کر سکا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے ہماری نئی فلم کی شوٹنگ کے سلسلہ میں یہ سوچا جا رہا تھا کہ فلم شروع کس طرح ہو۔ جب ہر شخص نے اپنے اپنے مغز کے مطابق رائے دی تو آخر مسٹر گپتا کھڑے ہو گئے اور انہوں نے سیٹھ صاحب سے فرمایا۔

"رائے صاحب! ابھی ادھر میرے مگز میں ایک بات آئی ہے۔ جب اسکرین پر شروع میں لائٹ پڑے تو اس میں سے ایک کتاب گرے جس پر لکھا ہو —— "اُجالا مندر کی پیش کش۔ جوانی اور بڑھاپا"۔

سبھوں نے اس عجیب و غریب آغاز کی بڑھ بڑھ کر داد دی اور میں حیران و پریشان مسٹر گپتا اور رائے صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ رائے صاحب نے مجھے خاموش دیکھ کر پوچھا۔ "آپ کیوں سائلنٹ ہیں ابرام بھائی"؟

میں نے کہا۔ "مظہر العجائب رائے صاحب! آپ پوچھ رہے ہیں کہ میں کیوں سائلنٹ ہوں۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ میں سائلنٹ کیسے نہ ہو جاتا مسٹر گپتا اور رائے صاحب اور دیگر لیڈیز اینڈ جنٹلمین! میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ لوگ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ جب سے دنیا قائم ہوئی ہے۔ اس وقت سے آج تک کسی توپ سے گولے کی بجائے کوئی کتاب گری ہے؟ محفل پر ایک منٹ کے لئے سنّاٹا طاری ہو گیا۔ میرا اعتراض معقول تھا مگر صاحب —— بھگوان نے مسٹر گپتا کو مگز دیا ہے۔ انہوں نے سنبھل کر مجھ پر وار کیا۔ "ابرام بھائی! ابھی سلا آپ کو ادھر فلم کا ٹیکنیکل بیوٹی معلوم نہیں۔ یہ تو نا دلٹی ہے

ابرام بھائی۔ ابھی تم ادھر اپنا لٹریری سائڈ سنبھالو"۔

چنانچہ میں نے لٹریری سائڈ سنبھال لی اور آج تک سنبھالے ہوئے ہوں اور خدا سے دست بدعا ہوں کہ مجھے اتنی طاقت عطا کرے کہ زندگی کے آخری سانس تک صرف لٹریری سائڈ سنبھالے رہوں اور اُدھر مسٹر گپتا توپ سے گولے کی بجائے کتاب۔ ٹوپی۔ جوتے۔ خربوزے۔ صابن۔ پوڈر کے ڈبے الابلا وغیرہ وغیرہ گرایا کریں اور نادلٹینز کی فہرست میں روز بروز اضافہ ہوتا رہے۔

مقام شکر ہے کہ مسٹر گپتا نے آج تک لٹریری سائڈ کی طرف توجہ نہیں کی ورنہ شاید مجھے دوسرے ہی دن فلم انڈسٹری سے باہر نکال دیا جاتا۔

جب میں مسٹر گپتا کو اپنے لکھے ہوئے مکالمے سناتا ہوں تو وہ مکالمے کے حسن و قبح کی طرف توجہ دینے کے بجائے اپنی ٹیکنیکل سائڈ ہی میں غرق رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مکالمہ سناتا ہوں۔

سریش نے شیلا سے کہا۔ "پیاری شیلا! ادھر آؤ"۔

تو مسٹر گپتا فرماتے ہیں۔ ٹرالی کمز فارورڈ"۔ اگلے فقرے پر مسٹر گپتا فرماتے ہیں۔ کیمرہ چینجز اینگل۔ کٹ اِن۔ کٹ آؤٹ" وغیرہ۔

اب میرا جی چاہتا ہے کہ سر کے بال نوچ لوں۔

اگر ساحر لدھیانوی اور حمید اختر وقتاً فوقتاً میری دلجوئی نہ کرتے ہوتے تو شاید فلم لائن چھوڑ کر میں اس ادبی مذاق رکھنے والی ایکٹرس کی پرائیویٹ سکریٹری شپ قبول کر لیتا جس نے مجھ سے اچھی تنخواہ۔ اچھا مکان۔ اچھا لباس اور جلد ترقی کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن چونکہ اکثر لوگوں نے کہا کہ ایک ایکٹرس کی پرائیویٹ سکریٹری

شپ میں عزت نہیں ہوتی - اسی لئے میں آج تک مسٹر گپتا کی رفاقت میں تنخواہ کو فنت اور عزت حاصل کر رہا ہوں۔

مسٹر گپتا کو بھی عزت کا بڑا خیال ہے۔ چنانچہ وہ مجھے اکثر نصیحت فرماتے ہیں۔

"اپنا ادھر کیا ہے سالا ابرام بھائی ـــــ عجت۔ فکت عجت۔ ابھی ادھر عجت نہیں ہے تو سالا پائیزن کھانے کا ٹائم آجائے گا۔ یہ روپیہ پیسہ تو سالا ہاتھ کا میل ہے"

یہ بالکل صحیح ہے کہ مسٹر گپتا کو عزت کا بڑا خیال رہتا ہے اور روپے پیسے کو وہ ہاتھ کا میل تصور کرتا ہے۔ مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ مسٹر گپتا کے ہاتھ ہمیشہ میلے کیوں رہتے ہیں؟"

بہت ممکن ہے کہ ان ساری باتوں کو سُننے کے بعد آپ یہ سوچ رہے ہوں کہ میں حد درجہ مبالغے سے کام لے رہا ہوں اور اکثر جگہ آپ کو سچائی پر جھوٹ کا گمان ہو تو یہ بد گمانی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اگر بالفرض اس مضمون میں کہیں کوئی واقعہ آپ کو واقعی جھوٹا معلوم ہو تو آپ یقین رکھئے کہ یہ واقعہ مستقبل قریب میں سچ میں تبدیل ہو جائے گا۔ کیونکہ ہم لوگوں کو مسٹر گپتا کی ذات سے چند خاص امیدیں وابستہ ہیں اور مسٹر گپتا ان لوگوں میں سے ہیں جو ملک و قوم کی نیک توقعات بکمال مستعدی پوری کرتے ہیں۔ مثلاً پچھلے دنوں مسٹر گپتا کے متعلق ساری فلم انڈسٹری میں ایک واقعہ مشہور ہو گیا۔ کہ کچھ لوگ مسٹر گپتا سے ملنے گئے۔ باتیں کرتے کرتے ایک ملاقاتی کو کہیں ٹیلیفون کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

چونکہ ٹیلیفون نمبر یاد نہیں تھا۔ اس لئے ملاقاتی نے مسٹر گپتا سے پوچھا۔
ڈائرکٹر صاحب۔ ڈائرکٹری کہاں ہے؟"
ڈائرکٹر صاحب نے شرما کر جواب دیا۔" جی۔ وہ تو پانی نہانے گئی ہوئی ہے"۔
ہم لوگوں نے جب یہ واقعہ سُنا تو آپ کی طرح ہم نے بھی اسے سفید جھوٹ ہی سمجھا اور امتحاناً ہم نے ایک دوسرے موقع پر مسٹر گپتا کی موجودگی میں کہیں ٹیلیفون کرنا چاہا اور ڈائرکٹری کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بہ کمال سادہ لوحی جواب دیا۔

"بھئی وہ تو آج کل بیمار ہے"

اب آپ ہی فرمایئے کہ اس واقعہ سے بھی آپ کو میری نسبت سخن سازی کا کوئی احتمال ہے؟۔ اگر نہیں ہے تو آیئے پھر ہم سب مل کر دعا کریں کہ اے باری تعالیٰ...... آمین۔ ثم آمین۔

فلمی پارلیمنٹ

پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر محمد علی اور ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو، یہ دعویٰ کبھی نہیں کر سکتے کہ پاکستان کے سارے آٹھ کروڑ اور ہندوستان کے سارے ۳۶ کروڑ باشندے انھیں پسند کرتے ہیں۔ ان کے وفادار ہیں اور ان سے ان کا کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے ——

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ دونوں ملکوں کے سینکڑوں باشندے ان دونوں وزیر اعظموں کو پسند نہیں کرتے۔ ان کے وفادار نہیں ہیں۔ اور ان کا ان دونوں وزیر اعظموں سے اتنا شدید اختلاف رائے ہے کہ اگر انہیں موقع ملے تو وہ مسٹر محمد علی اور پنڈت جواہر لال نہرو دونوں کو ان کی گدیوں سے اتار دیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں ایسی کونسی دو شخصیتیں ہیں جنھیں دونوں ملکوں کے سارے عوام پسند کرتے ہیں۔ ایک شخص بھی ان کا غدار نہ ہو اور ایک شخص کو بھی ان سے اختلاف رائے نہ ہو۔

بڑے غور و فکر اور چھان بین کے بعد میں نے پتہ لگایا تو پاکستان میں مجھے وہ شخصیت فلم اسٹار نور جہاں کی شکل میں نظر آئی اور ہندوستان میں وہ ہر دلعزیز شخصیت فلمسٹار نرگس کے نام سے مشہور ہے۔

اس کے بعد میں نے یہ سوچنا شروع کر دیا۔ کہ اگر نور جہاں پاکستان کی وزیر اعظم اور نرگس ہندوستان کی وزیر اعظم ہوتی تو دونوں ملکوں کا کیا حال ہوتا؟ —— دونوں ملکوں کے آپس کے تعلقات کس قسم کے ہوتے اور ان دونوں ملکوں کا انجام کیا ہوتا؟

میری ناچیز رائے یہ ہے کہ نور جہاں کو پاکستان کی اور نرگس کو ہندوستان کی وزیر اعظم فوراً بلا تاخیر مقرر کر دینا چاہئے۔ کیونکہ دونوں ملکوں کی اور ان کے عوام کی بھلائی اسی میں ہے۔ دونوں ملک ترقی کرتے کرتے "ٹیکنی کلر" ہو جائیں گے اور اہل دل کی مرادیں بر آئیں گی۔ میری نظر میں دونوں حکومتوں کے وزرا کا ایک پینل PANEL ہے جو اس قسم کا ہے:۔

پاکستان:۔ گورنر جنرل پاکستان — ببو

وزیر اعظم	نور جہاں
وزیر خارجہ	خورشید
وزیر داخلہ	نگہت سلطانہ
وزیر تجارت	گلشن آرا
وزیر صنعت	سورن لتا
وزیر صحت	صبیحہ

وزیر تعلیم	نینا (علیگ)
وزیر خوراک	شمی
وزیر امور کشمیر	ملکہ پکھراج
وزیر خزانہ	شمیم
وزیر مہاجرین	کلاوتی
وزیر مواصلات	زرینہ ریشمان
وزیر محنت	سیما (نیا چہرہ)
ہندوستان:۔ صدر جمہوریہ،	درگا کھوٹے
وزیر اعظم	نرگس
وزیر خارجہ	کامنی کوشل
وزیر داخلہ	بیگم پارہ
وزیر خزانہ	گیتا بالی
وزیر تجارت	نمی
وزیر صنعت	شیاما
وزیر صحت	مینا
وزیر تعلیم	لیلا چٹنس بی-اے
وزیر خوراک	نلنی جیونت
وزیر امور کشمیر	بینا رائے
وزیر مواصلات	مدھو بالا

وزیر مہاجرین نگار سلطانہ

وزیر محنت اوما دیوی (ٹن ٹن)

مجھے یقین ہے کہ نور جہاں اور نرگس اپنی اپنی ان کابیناؤں کے ساتھ عنانِ حکومت سنبھال لیں تو پھر دونوں ملکوں کا بیڑا پار ہو جائے گا۔ ملک پھولے پھلے گا اور "رعایائیں" خوش حال رہیں گی۔

ان حکومتوں کا سب سے پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ ملک میں کوئی مخالف سیاسی جماعت قایم نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ ——— نور جہاں اور نرگس اگر کوئی غلط سے غلط کام بھی انجام دیں تو لوگ سر جھکا کر یہ مصرعہ پڑھیں گے۔

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

چونکہ دونوں ملکوں میں کوئی مخالف سیاسی جماعت نہیں ہوگی اس لئے نہ کوئی سیفٹی ایکٹ ہوگا اور نہ سیاسی مجرم۔ جیل خانوں کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ کیونکہ ساری رعایا کسی نہ کسی حور شمائل کی زلفوں کی اسیر ہوگی

حکومت چونکہ ساری عورتوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ اس لئے مرد گھروں میں رہیں گے۔ چولہا پھونکیں گے، روٹی پکائیں گے۔ بچوں کو سنبھالیں گے انہیں دودھ پلائیں گے اور فرصت کے اوقات میں سوئٹر بنیں گے۔ کٹر قسم کے مسلمان مرد پردہ بھی کریں گے۔

دونوں ملکوں میں ہر مہینے سات دن مکمل چھٹیاں رہیں گی۔ ان "ماہواری چھٹیوں" میں حکومتیں چاہیں تو کمی بیشی بھی کیا کریں گی۔ آب و ہوا بڑی خوش گوار ہوگی، ہوا ایوی ننگ اِن پیرس اور سچیف کی خوشبوؤں سے مہکتی رہے

گی اور اب کی تو کوئی کمی نہیں ہوگی جگہ جگہ آنکھوں کی جھیلیں ہونگی کوئی نہ پانی کا پیاسا ہوگا اور نہ دیدار کا پیاسا، دونوں ملکوں میں مسجدوں اور مندروں کے بجائے جگہ جگہ سینما ہال تعمیر کئے جائیں گے اور سینما گھروں کی تعمیر کیلئے اسی طرح چندے جمع کئے جائیں گے جس طرح ان دنوں مسجدوں اور مندروں کی تعمیر کیلئے چندے جمع کئے جاتے ہیں سینما گھروں کی تعمیر کیلئے نور جہاں فنڈ اور نرگس فنڈ جاری کئے جائینگے۔

شرنارتھیوں اور مہاجرین کی آبادی کا سلسلہ آپ ہی آپ طے ہو جائے گا۔ ہر شخص کسی نہ کسی کے دل میں رہے گا۔ اور زلفوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آرام سے سویا کرے گا۔ لوگوں کو خوراک کی بھی کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ کیونکہ وزیر خوراک شمی اور وزیر خوراک فلمی جیونت بجائے خود بڑی لذیذ "خوراک" ہیں، خوراک کے علاوہ پھل پھلاری کی بھی کوئی کمی نہیں ہوگی۔ گالوں کے سیب ...... کے انار اور آنکھوں کے بادام عام ہوں گے۔

محبت اور شادیاں عام ہو جائیں گی۔ محبت میں فلمی محبت کی طرح پہلی نظر کی محبت کو ترجیح دی جائے گی اور فلموں کی طرح ہر رقیب پر لازم ہوگا کہ وہ شادیوں کا سارا بندوبست اپنے پیسے سے کرے اور عین شادی کے وقت دولہا کی جگہ عاشق کے لئے خالی کر دے۔ حکومت کی طرف سے "چٹ محبت اور پٹ بیاہ" کے سلسلہ میں ایک خاص قانون بھی نافذ کیا جائے گا۔

سرکاری عہدوں کے لئے اداکاری اور ناچ گانا لازمی شرائط قرار دئے جائیں گے۔ مقابلے کے امتحانوں کے لئے حیاتِ نور جہاں اور نرگس کی خود نوشت سوانح عمری کا مطالعہ لازمی قرار دیا جائے گا۔ نوکریوں کے انٹرویو میں بالعموم اس قسم کے سوالات کئے جائیں گے۔

(١) فلم اسٹار ریٹا ہیورتھ نے کتنی شادیاں کی ہیں اور مستقبل میں کتنی شادیاں کرے گی؟ بغیر سوچے سمجھے جواب دو!

٢۔ مدھوبالا کس سے شادی کرے گی؟

٣۔ پری چہرہ نسیم بانو کے کتنے بچے ہیں؟ اور کب کب پیدا ہوئے۔ ہر ایک کی تاریخ اور سن بتاؤ۔

٤۔ خوبصورتی میں نمبر دو۔

(١) شاہینہ (٢) مدھوبالا (٣) کامنی کوشل اور نلنی جیونت

٥۔ اگر انگرڈ برگن ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا صدر بنایا جائے تو کوریا کی جنگ کا کیا حال ہوگا؟

٦۔ اگر چین کے صدر حکومت ماؤزے تنگ کی شادی ہندوستان کی وزیر اعظم نرگس سے اور امریکہ کے صدر آئزن ہاور کی شادی پاکستانی وزیر خوراک شمی سے کر دی جائے تو ہندوستان اور چین کے تعلقات کیسے رہیں گے؟ اور امریکہ پاکستان کو کتنے کروڑ ڈالر کی امداد دے گا؟

جو امیدواران ان سوالات کا ٹھیک ٹھیک جواب دیں گے انہیں فلم اسٹار بنا دیا جائے گا۔

پاکستان اور ہندوستان غیر ممالک میں صرف فلمیں اور بچے برآمد کریں گے۔ اور دونوں ملکوں کی درآمد میں صرف یہ اشیاء ہوں گی۔ لپ اسٹک پاؤڈر، روج، سینٹ، لیڈیز سوئمنگ کاسٹیوم باڈیز اور کوٹیکس کے تھیلے۔

پاکستان کا قومی ترانہ ہوگا۔

سارے جہاں سے اچھی نور جہاں ہماری

اور ہندوستان کا قومی ترانہ ہوگا۔

نرگس کی ناگ لمبی قومی نشاں ہمارا

ملک میں ایکسٹرا ایکٹر اور ایکٹریسیں سپلائی کرنے کی تجارت کے علاوہ اور کسی تجارت کی اجازت نہیں ہوگی

اسکولوں میں صرف فلموں سے متعلق نصاب پڑھایا جائے گا۔ پریم یا محبت لازمی مضمون ہوگا۔ ملک کی قومی زبان وہ ہوگی جس میں مرد اور عورتیں بہ آسانی محبت کے جذبات ادا کرسکیں۔ اس کے لئے ہندوستان میں ہندی اور پاکستان میں اردو بہتر زبان رہے گی۔ کیونکہ دونوں زبانوں میں عشقیہ اشعار بکثرت موجود ہیں، ہر مرد اور عورت پر یہ لازم ہوگا کہ وہ جب ایک دوسرے سے ملیں تو ان کے ناموں سے مخاطب نہ کیا کریں، بلکہ مرد عورت کو سجنی اور پریتما وغیرہ کہہ کر مخاطب کیا کریں اور عورت مرد کو بالم، ساجن۔ پیا وغیرہ کہہ کر بلایا کرے۔ اس کی خلاف ورزی مستوجب سزائے قید یا جرمانہ یا عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں مزید قید بامشقت ہوگی۔ مرد اور عورت جب ایک جگہ ہوں تو پہلے ایک دوگانا گائیں اس کے بعد بات چیت شروع کریں۔ عورتیں اکیلی ہوں تو موقع بے موقع گاتی رہیں اور ناچتی رہیں۔ حتیٰ کہ کوئی مرجائے تو اس کی لاش کے قریب جاکر عورت پہلے گانا گائے اس کے بعد روئے۔ اگر شوہر یا محبوب مرجائے تو عورت کو اس قسم کا گیت گانا پڑے گا۔

چلے گئے چلے گئے دل میں آگ لگانے والے

اور اگر باپ یا بھائی مر جائے تو اس قسم کا گیت الاپے

باپ بھلا نہ بھیا بھیا
سب سے بھلا روپیا

دونوں ملکوں میں صرف فلمی اخباروں اور رسالوں کو اشاعت کی اجازت ہوگی جن میں صفحۂ اول کی پہلی خبر فلموں سے متعلق ہو مثلاً :-

"وزیر اعظم نورجہاں نے کرکٹ کے مشہور کھلاڑی نذر محمد کو پاکستانی کرکٹ ٹیم کا کپتان مقرر کیا۔"

"بیگم پارہ بلیک اینڈ وہائٹ وہسکی کی ساری بوتل بغیر سوڈے کے غٹا غٹ پی گئی۔"

"گلشن آرا عنقریب مسٹر محبوب نوروزی سے شادی کرلے گی۔"

"کوریا کی جنگ صرف بیگم پارہ ختم کرا سکتی ہے۔ کیونکہ امریکی سپاہیوں کو بیگم پارہ سے عشق ہے۔"

نرگس اور نورجہاں کے وزیر اعظم بن جانے کے بعد مسئلہ کشمیر بآسانی حل ہو جائے گا۔ کیونکہ دونوں کشمیر کو دونوں ملکوں کا ایک مشترکہ اسٹوڈیو قرار دے دیں گے۔ جہاں دونوں ملکوں کو صرف اپنی اپنی فلمیں شوٹ کرنے کی اجازت ہوگی۔ کشمیری عوام کو ایکٹر اور ایکٹرسیں بنا دیا جائے گا اور انہیں فلمی MAN POWER کے طور پہ استعمال کیا جائے گا۔

اگر کبھی دونوں ملکوں کے درمیان متروکہ جائداد اور نہری پانی وغیرہ کے سلسلہ میں کچھ اختلاف ہوگا بھی تو دونوں میں کوئی جنگ نہیں ہوگی

البتہ ادہر نورجہاں پاکستان کی سرحد پہ اور نرگس ہندوستان کی سرحد پر آمنے سامنے کھڑی ہو جائیں گی اور ایک دوسرے کو اس طرح کوسنے دینے شروع کر دیں گی۔

کیوں ری نرگس! نوج تو نے میری نہر کا پانی کیوں روک دیا۔ تجھے زمین نگل جائے۔ ہڑدنگی کہیں کی۔

نرگس جواب دے گی۔

ادموئی نورجہاں! اچھلی پائی کم ذات تو نے میری مالدار رعایا کی ساری بڑی بڑی بلڈنگیں دبا رکھی ہیں تو میں تیری نہروں کا پانی کیوں نہ روکوں۔ نوج تجھ پہ خدا کی مار میسے منہ لگتی ہے۔ الل بچھیری۔

۔ اگر بات زیادہ بڑھے تو نورجہاں نرگس کا چونڈا پکڑ لے گی اور چھالیہ کترنے کا سروتہ لے کر نورجہاں کے سر پہ دے مارے گی۔ لیکن پھر شام تک چیخ چیخ کر دونوں پڑوسنیں تھک جائیں گی اور دوسرے دن ان کی صلح ہو جائے گی۔

دونوں حکومتوں کی خارجی پالیسی کا جہاں تک تعلق ہے دونوں ملک کامن ویلتھ میں رہیں گے۔ کیونکہ بہ حیثیت ایکٹریس نرگس بھی "کامن ویلتھ" ہے اور نورجہاں بھی کامن ویلتھ۔ لیکن کامن ویلتھ ہونے کے باوجود وہ اشتراکی نظام سے دور رہیں گی۔ کیونکہ دونوں حکومتیں اصل میں ہالی وڈ کی حکومت کی ماتحت ہیں۔ اس کے علاوہ اشتراکی ممالک میں برسرعام یعنی پردہ ہمیں

پر ننگی رانوں، سینے کی ضرورت سے زیادہ نمائش اور بوسہ بازی کی ممانعت ہے اور ان کے بغیر فلمیں چلتی نہیں -

دونوں ملکوں میں صرف ایک ہی صنعت ہوگی - اور وہ ہوگی فلمی صنعت پاکستان کا قومی پرچم نورجہاں کا دوپٹہ ہوگا اور ہندوستان کا قومی پرچم نرگس کی ساڑی کا آنچل - ان پرچموں کی چھاؤں میں دونوں ملکوں کی رعایائیں چین کی ـــــ بنسری بجا بجا کر یہ گایا کریں گی -

فلموں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
ابرو نسیم کی ہے قومی نشان ہمارا

ہائے ہائے کیا زمانہ ہوگا جب پاکستان کی وزیر اعظم بے بی نورجہاں اور ہندوستان کی وزیر اعظم بے بی نرگس ہوگی، آیئے ہم سب مل کر دونوں کو وزیر اعظم بنانے کی کوشش کریں اس کے لئے سب سے پہلے رائے عامہ کو ہموار کرنے کی ضرورت پڑے گی - قارئین ـــــ سے التماس ہے کہ وہ میری تجویز کے حق میں یا مخالفت میں اپنی اپنی تجویزیں ـــــ ارسال فرمائیں۔ ورنہ بھائیو موجودہ محمد علی اور نہرو حکومتوں کے زیر سایہ تو ہم بے موت مارے جائیں گے اور فلک سے بار بار یہی شکوہ کرنا پڑے گا کہ :-

مار ڈالا اس وطن نے اور ہندستان نے

مُرلی کی دُھن
چوٹی کی اداکارہ

سعادت حسن منٹو

مُرلی کی دُھن

اپریل کی تیئس یا چوبیس تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں رہا۔ پاگل خانے میں شراب چھوڑنے کے سلسلے میں زیرِ علاج تھا۔ کہ شیام کی موت کی خبر ایک اخبار میں پڑھی۔ ان دنوں ایک عجیب و غریب کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے ایک چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہوش مندی کا علاقہ کب شروع ہوتا ہے۔ اور میں بے ہوشی کے عالم میں کب پہنچتا ہوں۔ دونوں کی سرحدیں کچھ اس طرح آپس میں گڈمڈ ہو گئی تھیں کہ میں خود کو "نومینز لینڈ" میں بھٹکتا محسوس کرتا تھا۔

شیام کی موت کی خبر چنانچہ جب میری نظروں سے گذری۔ تو میں نے سمجھا یہ ترکِ شراب کی کارستانی ہے۔ جس نے میرے ذہن میں ہلچل پیدا کر رکھی ہے۔ اس سے قبل نیم خوابی کے عالم میں کئی عزیزوں کی موتیں میرے لئے واقع ہو چکی تھیں اور نیم ہوش مندی کے وقت مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ

وہ سب کے سب زندہ ہیں۔ اور میری صحت کے لئے دعائیں مانگ رہے ہیں
مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب میں نے یہ خبر پڑھی۔ تو ساتھ والے کمرے کے پاگل سے کہا۔" جانتے ہو۔ میرا ایک نہایت ہی عزیز دوست مر گیا ہے۔"

اُس نے پوچھا۔" کون ؟"

میں نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔" شیام "

" کہاں ؟ یہاں پاگل خانے میں ؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُوپر تلے کئی تصویریں میرے مضطرب دماغ میں اُبھریں۔ جن میں شیام تھا۔ مسکراتا شیام، ہنستا شیام، شور مچاتا شیام، زندگی سے بھرپور شیام، موت اور اُس کی ہولناکیوں سے قطعاً ناآشنا شیام ــــ میں نے سوچا جو کچھ میں نے پڑھا ہے بالکل غلط ہے ــــ اخبار کا وجود میرے دماغ کی اختراع ہے۔

آہستہ آہستہ الکحل کی دھند دماغ سے ہٹنے لگی۔ اور میں تمام واقعات کو اُن کے صحیح خدوخال میں دیکھنے لگا۔ مگر یہ عمل کچھ اس قدر سست رفتار تھا کہ جب میں شیام کی موت کے حادثے سے دوچار ہوا تو مجھے زبردست دھکا نہ لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ عرصہ ہوا مر چکا تھا۔ اور اس کی موت کا صدمہ بھی عرصہ ہوا مجھے پہنچ چکا تھا۔ اب صرف اس کے آثار باقی تھے۔ صرف ملبہ رہ گیا تھا۔ آہستہ آہستہ جس کی میں کھدائی کر رہا تھا۔ شکستہ اینٹوں کے ڈھیر میں کہیں کہیں شیام کی مسکراہٹ دبی ہوئی مل جاتی تھی۔ کہیں اسکا بانکا قہقہہ
پاگل خانے سے باہر فرزانوں کی دنیا میں یہ مشہور تھا کہ سعادت حسن منٹو

شیام کی موت کی خبر سُن کر پاگل ہو گیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو مجھے بہت افسوس ہوتا شیام کی موت کی خبر سُن کر مجھے زیادہ ہوش مند ہو جانا چاہیے تھا۔ دنیا کی بے ثباتی کا احساس میرے دل و دماغ میں زیادہ شدید ہو جانا چاہیے تھا۔ اور انتقامی جذبے کے تحت اپنی زندگی کو پوری طرح استعمال کرنے کا عزم میرے اندر پیدا ہو جانا چاہیے تھا۔ . . . شیام کی موت کی خبر سُن کر پاگل ہو جانا محض پاگل پن تھا۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سر گشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

رسوم و قیود کے بتوں کو توڑنے والے شیام کی موت پر پاگل ہو جانا اسکی بہت بڑی توہین تھی۔

شیام زندہ ہے اپنے دو بچوں میں جو اس کی بے لوث محبّت کا نتیجہ ہیں تاجی (ممتاز) میں جو بقول اُس کے اس کی کمزوری تھی۔ اور اُن تمام عورتوں میں جن کی اوڑھنیوں کے آنچل اُس کے محبّت بھرے دل پر گاہے گاہے سایا کرتے رہے اور میرے دل میں جو صرف اس لئے سوگوار ہے۔ کہ وہ اس کی موت کے سرہانے یہ نعرہ بلند نہ کر سکا "شیام زندہ باد!"

مجھے یقین ہے موت کے ہونٹوں کو بڑے خلوص سے چومتے ہوئے اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ہوتا "منٹو ـــــ خدا کی قسم ان ہونٹوں کا مزا کچھ اور ہی ہے"

میں جب بھی شیام کے متعلّق سوچتا ہوں۔ تو مجھے مشہور روسی ناول نویس آرتزبی شیف کا ہیرو سینائن یاد آجاتا ہے۔ شیام عاشق تھا، عشق پیشہ نہیں تھا وہ ہر خوبصورت چیز پر مرتا تھا ـــــ میرا خیال ہے کہ موت ضرور خوبصورت ہوگی،

ورنہ وہ کبھی نہ مرتا۔

اُس کو تپش اور حدت سے پیار تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ موت کے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ میں نہیں مانتا۔ شیام ٹھنڈے ہاتھوں کا بالکل قائل تھا۔ اگر واقعی موت کے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے تو اس نے یہ کہہ کر ایک طرف جھٹک دیئے ہوتے۔ "ہٹو بڑی بی ـــ تم میں خلوص نہیں ہے؟"

مجھے ایک خط میں لکھتا ہے۔

قصّہ یہ ہے جانِ من! کہ یہاں ہر ایک "ہپ ٹلا" ہے لیکن اصلی "ہپ ٹلا" یہاں سے بہت دُور لیکن میری پوچھتے ہو تو بھی کوئی ایسی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ کہ حرفِ شکایت لب پر لاؤں ۔۔۔۔ زندگی خوب گذر رہی ہے ـــ رندی و بے نوشی اے نوشی و رندی! ساتھ ساتھ چل رہی ہے تاجی (ممتاز) چھ مہینے کے عرصے کے بعد واپس آگئی ہے وہ ابھی تک میری ایک بڑی زبردست کمزوری ہے۔ اور تم جانتے ہو عورت کی محبت کی گرمی کی راحت محسوس کرنا کتنی فرحت انگیز چیز ہے! ۔۔۔۔ آخر میں انسان ہوں ایک نورمل انسان۔

نگار (نگار سلطانہ) کبھی کبھی ملتی ہے۔ لیکن اوّلین حق "ت" کا ہے

شاموں کو تمہاری "دانشمندانہ بکواس" اکثر یاد آتی ہے

شیام نے اس خط میں ایک لفظ "ہپ ٹلا" استعمال کیا ہے۔ اسکی تشریح چونکہ خالی از دلچسپی نہیں۔ اس لئے آپ بھی سن لیجئے۔

میں بمبئی ٹاکیز میں ملازم تھا۔ ان دنوں کمال امروہی کی فلمی کہانی "حویلی" (جو "محل" کے نام سے فلمائی گئی) کی تشکیل و تکمیل ہو رہی تھی۔ اشوک۔ واچا حسرت (لکھنوی) اور میں سب ہر روز بحث و تمحیص میں شامل ہوتے تھے۔ ان نشستوں میں کام کے علاوہ کبھی کبھی خوب زوروں پر گپ بھی چلتی تھی۔ ایک دوسرے سے مذاق ہوتے۔ شیام کو جب فلم "مجبور" کی شوٹنگ سے فراغت ہوتی۔ تو وہ بھی ہماری محفل میں شریک ہو جاتا۔

کمال امروہوی کو عام گفتگو میں بھی ٹھیٹ قسم کے ادبی الفاظ استعمال کرنے کی عادت ہے۔ میرے لئے یہ ایک مصیبت ہو گئی تھی۔ اس لئے کہ اگر میں عام فہم انداز میں کہانی کے متعلق اپنا کوئی نیا خیال پیش کرتا تو اُس کا اثر کمال پر پوری طرح نہیں ہوتا تھا۔ اس کے برعکس اگر میں زوردار الفاظ میں اپنا عندیہ بیان کرتا تو اشوک اور واچا کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ چنانچہ میں ایک عجیب قسم کی ملی جلی زبان استعمال کرنے لگا۔

ایک روز صبح گھر سے بمبئی ٹاکیز آتے ہوئے میں نے ٹرین میں اخبار کا اسپورٹس کالم کھولا۔ برے برن اسٹیڈیم میں کرکٹ میچ ہو رہے تھے۔ ایک کھلاڑی کا نام کچھ عجیب و غریب تھا۔ "ہپ ٹلا" ——— ایچ ای، پی، ٹی، یو، ایل، ایل، ایچ، اے ——— ہپ ٹلا۔ . . . . میں نے بہت سوچا۔ کہ آخر یہ کیا ہو سکتا ہے مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ شاید ہیبت اللہ کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔

اسٹڈیو پہنچا تو کمال کی کہانی کی فلمی تشکیل کا کام شروع ہوا۔ کمال نے اپنے مخصوص ادیبانہ اور اثر پیدا کرنے والے انداز میں کہانی کا ایک باب سنایا۔ مجھ سے اشوک نے رائے طلب کی۔ "کیوں منٹو؟"

معلوم نہیں کیوں، میرے منہ سے نکلا "ٹھیک ہے۔ مگر ہپ ٹلا نہیں!" بات کچھ بن ہی گئی۔ ہپ ٹلا" میرا مطلب بیان کر گیا۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ سیکونس زوردار نہیں ہے۔

کچھ عرصے کے بعد حسرت نے اسی باب کو ایک نئے طریقے سے پیش کیا۔ میری رائے پوچھی گئی۔ تو میں نے اب کی دفعہ ارادی طور پر کہا۔ "بھئی حسرت بات نہیں بنی ـــــ کوئی ہپ ٹلا چیز پیش کرو۔ ہپ ٹلا"

دوسری مرتبہ ہپ ٹلا کہہ کر میں نے سب کی طرف ردِ عمل معلوم کرنے کیلئے دیکھا۔ یہ لفظ اب معنی اختیار کر چکا تھا۔ چنانچہ اس نشست میں بلا تکلیف میں نے اسے استعمال کیا۔ ہپ ٹلیٹی نہیں۔ ہپ ٹولائز کرنا چاہیے وغیرہ وغیرہ لیکن اچانک ایک بار اشوک مجھ سے مخاطب ہوا "ہپ ٹلا کا اصل مطلب کیا ہے؟ کس زبان کا لفظ ہے؟"

شیام اُس وقت موجود تھا۔ جب اشوک نے مجھ سے یہ سوال کیا۔ اُس نے زور کا قہقہہ لگایا۔ اُس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ ٹرین میں وہ میرے ساتھ تھا۔ جب میں نے کرکٹ کے کھلاڑی کے اس عجیب وغریب نام کی طرف اس کو متوجہ کیا تھا۔ ہنس ہنس کے دوہرا ہوتے ہوئے اُس نے سب کو بتایا۔ کہ یہ منٹو کی نئی منٹویت ہے جب کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تو ہپ ٹلا کو کھینچ کر فلمی دنیا میں لے آیا۔ مگر کھینچا تانی کے

بغیر یہ لفظ بمبئی کے فلمی حلقوں میں رائج ہو گیا۔

۲۹ ۸/۴۸ کے خط میں شیام مجھے لکھتا ہے:۔

پیارے منٹو! اب کی دفعہ تم پھر خاموش ہو۔ تمہاری یہ خاموشی مجھے بہت دق کرتی ہے۔ اس کے باوجود کہ میں تمہارے دماغی تساہل سے بخوبی واقف ہوں میں غصے سے دیوانہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جبکہ تم یک لخت چپ سادھ لیتے ہو۔ اس میں شک نہیں کہ میں بھی کوئی بہت بڑا خط باز نہیں ہوں۔ لیکن مجھے ایسے خط لکھنے اور وصول کرنے میں لطف حاصل ہوتا ہے جو ذرا "الگ قسم" کے ہوں۔۔۔ یعنی ہپ ٹلا!

لیکن ہپ ٹلا یہاں بہت ہی نایاب چیز ہو گئی ہے۔۔۔ اسے کاغذ پر لکھو تو کم بخت "ہپ ٹلی" بن جاتی ہے، اور اگر یہ ہپ ٹلی بھی دستیاب نہ ہو تو بتاؤ کتنی کوفت ہوتی ہے معاف کرنا، اگر میں نے ہپٹو لائز کرنا شروع کر دیا ہو۔۔۔ لیکن کیا کروں۔ جب حقیقتیں گم ہو جائیں، تو انسان ہپٹو نیٹ ہی کرتا ہے مگر مجھے کچھ پرا نہیں کہ تم کیا کھو گئے کیا نہیں کھو گئے میں اتنا جانتا ہوں۔ اور تمہیں اس کا علم ہوگا کہ تم ایسے بڑے ہپ ٹلا کو اس میدان میں شکست دینے کا سہرا صرف میرے ہی سر ہے۔

منٹو! کسی نے کہا ہے جب عاشق کے پاس لفظ ختم ہو جاتے ہیں تو وہ چومنا شروع کر دیتا ہے۔ اور جب کسی مقرر کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے تو وہ کھانسنے لگتا ہے میں اس کہاوت میں ایک اور چیز شامل کرتا ہوں جب مرد کی مردانگی ختم ہو جاتی ہے تو وہ اپنے ماضی کو پلٹ پلٹ کر دیکھنے لگتا ہے۔ لیکن تم فکر مند نہ ہونا میں اس آخری منزل سے کچھ دور ہوں۔ زندگی بہت مصروف اور بھرپور رہے اور بھرپور زندگی میں تم جانتے ہو دیوانگی کے لئے بہت کم فرصت ملتی ہے حالانکہ مجھے اسکی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے

نسیم والا فلم (چاندنی رات) قریب قریب نصف مکمل ہو چکا ہے۔ امرناتھ سے ایک فلم کا کنٹریکٹ کر چکا ہوں ذرا سوچو تو میری ہیروئن کون ہے؟ — نگار (نگار سلطانہ) میں نے خود اس کا نام تجویز کیا تھا محض یہ معلوم کرنے کے لئے کہ پرانے پرانے جذبات کا اعادہ کیسے لگتا ہے جو کبھی کسی سے حقیقت کی دنیا میں متعلق رہے ہیں پہلے مسرت تھی، اب محض کاروبار لیکن کیا خیال ہے تمہارا یہ سلسلۂ جوش آخری نہیں رہے گا۔

تاجی، ابھی تک میری زندگی میں ہے۔ نگار بہت ہی اچھی ہے اور اس کا سلوک بے حد نرم و نازک پچھلے تین

سے رمولا بھی یہاں بمبئی میں ہے ۔ اس سے ملاقات کرنے
پر مجھے معلوم ہوا ۔ کہ وہ ابھی تک اس کمزوری کو جو اُس کے
دل و دماغ میں میری طرف سے موجود ہے مغلوب نہیں کر
سکی ۔ چنانچہ اسکے ساتھ بھی سیر و تفریح رہی ۔

اولڈ بوائے میں ان دنوں فلرٹیشن کے فن میں اڈوانس
ٹریننگ لے رہا ہوں ۔ مگر درست یہ سارا سلسلہ بہت ہی
پیچیدہ ہو گیا ہے ۔ بہر حال میں پیچیدگیاں پسند کرتا ہوں
وہ میرے اندر جو قسمت آزما مہم جو اور آوارہ گرد ہے
ابھی تک کافی طاقت ور ہے میں کسی مخصوص جگہ کا نہیں اور
نہ کسی مخصوص جگہ کا ہونا چاہتا ہوں ۔ میں لوگوں سے
محبت کرتا ہوں ۔ اور اُن سے نفرت کرتا ہوں ۔ زندگی
یوں ہی گذر رہی ہے ۔ در اصل زندگی ہی ایک ایسی معشوقہ
ہے جس سے مجھے محبت ہے ، لوگ جائیں جہنم میں !

مجھے مصنّف کا نام بھول گیا ہے ۔ مگر اُس کا ایک جملہ
یاد رہ گیا ہے ۔ شاید وہ بھی درست نہ ہو ۔ مگر مفہوم کچھ
اسی قسم کا تھا . . . وہ لوگوں سے اس قدر محبت کرتا تھا
کہ خود کو محبت کرنے میں ، کبھی تنہا محسوس نہیں کرتا تھا ۔
لیکن وہ اس طور پر ان سے نفرت کرتا تھا کہ نفرت کرنے
میں خود کو یکہ و تنہا محسوس کرتا تھا ۔"

میں اس میں اور کوئی فقرہ شامل نہیں کر سکتا

ان دو خطوں میں تاجی کا ذکر آیا ہے۔ خطوط و عدانی میں اتنا تو میں بتا چکا ہوں کہ یہ ممتاز کی تصغیر ہے۔ ممتاز کون ہے یہ خود شیام بتا چکا ہے کہ وہ اس کی کمزوری ہے۔ سچ پوچھئے تو نگار، رمولا سب اس کی کمزوریاں تھیں۔ عورت دراصل اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اور یہی اُس کے کردار کا مضبوط ترین پہلو تھا۔

ممتاز، زیب قریشی ایم۔ اے کی چھوٹی بہن ہے۔ زیب کے ساتھ بمبئے گئی تو وہاں ظہور راجہ کے بھاری بھرکم عشق میں پھنس گئی۔ کچھ عرصے کے بعد اس سے اپنا دامن چھڑا کر لاہور آئی۔ تو شیام کے ساتھ رومانس شروع ہو گیا۔ بمبئے میں جب شیام کی مالی حالت درست ہوئی تو۔ تو اس نے اپنے ہونے والے بچوں کی خاطر اس سے شادی کر لی۔

شیام کو بچوں سے بہت پیار تھا۔ خاص طور پر خوبصورت بچوں سے خواہ وہ حد درجہ بدتمیز ہی کیوں نہ ہوں۔ طہارت و نفاست پسند طبقوں کی نظر میں وہ خود بہت بڑا بدتمیز تھا۔ بعض عورتیں تو اس سے اس کی بدتمیزیوں کی وجہ سے سخت نفرت کرتی تھیں۔ مگر وہ بالکل بے پروا تھا۔ اس نے کبھی ان عورتوں کی خوشنودی کے لئے اپنی عادات سنوارنے کی کوشش نہ کی۔ اس کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ منٹو ۔۔۔ میری باتیں سن کر یہ ناک بھوں چڑھانے والی سالیاں سب بنتی ہیں ۔۔۔ میک اپ کی دنیا میں رہتی ہیں۔"

لیکن بعض عورتیں اس کی بدتمیزیوں سے محبت بھی کرتی تھیں۔ کیونکہ ان میں بستر کی بو نہیں ہوتی تھی۔ شیام اُن سے کھلے مذاق کرتا۔ وہ بھی اُس سے ایسی باتیں کرتیں

جو مہذب سوسائٹی میں قابلِ ستر پوش سمجھی جاتی تھیں...... ہونٹوں پر مسکراہٹیں ناچتیں. حلق سے قہقہے اچھلتے. ہنستے ہنستے شیام کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اور اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ دور کونے میں طہارت پسندی نوکیلے کیلوں پر آسن جمائے اپنے گناہ بخشوانے کی رائیگاں کوشش کر رہی ہے۔

شیام سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی. یہ مجھے بالکل یاد نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اُس سے ملنے سے پہلے ہی مل چکا تھا. ویسے اب سوچتا ہوں تو اتنا یاد آتا ہے. کہ بمبئی میں اس سے شروع شروع کی ملاقاتیں شاید لیڈی جمشید جی روڈ پر ہوئی تھیں. جہاں میری بہن رہتی تھی "ہائی لنسٹ" میں بالائی منزل کے ایک فلیٹ میں ڈائمنڈ رہتی تھی. اس کے ہاں شیام کا آنا جانا تھا۔ دو تین مرتبہ غالباً میرٹھیون میں اس سے ملنا ہوا۔ یہ ملاقاتیں گو رسمی تھیں. لیکن پھر بھی غایت درجہ بے تکلف تھیں. کیونکہ شیام نے مجھے خود ہی بتا دیا تھا کہ ڈائمنڈ نام کی عورت جو مسز شیام کہلاتی ہے، درحقیقت اس کی بیوی نہیں لیکن تعلقات کی بنا پر وہ بیوی سے کچھ زیادہ ہی ہے. وہ ازدواجی رشتے اور اس کے اشتہار کا بالکل قائل نہیں تھا لیکن جب ایک تکلیف کے سلسلے میں اُسے ڈائمنڈ کو ہسپتال داخل کرانا پڑا. تو اُس نے رجسٹر میں اس کا نام مسز شیام ہی لکھوایا۔

بہت دیر بعد ڈائمنڈ کے شوہر نے مقدمے بازی کی. شیام کو بھی اس میں پھنسایا گیا. لیکن معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اور ڈائمنڈ جو کہ اب فلمی دنیا میں قدم رکھ چکی تھی۔ اور روزنی جیبیں دیکھ چکی تھی۔ شیام کی زندگی سے نکل گئی. مگر شیام اُس کو اکثر یاد کرتا تھا۔

مجھے یاد ہے۔ پونے کے ایک باغ میں اس نے مجھے سیر کراتے ہوئے کہا "منٹو — ڈائمنڈ گریٹ عورت تھی — خدا کی قسم جو عورت اسقاط برداشت کرسکتی ہے۔ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی صعوبت کا مقابلہ کرسکتی ہے"۔ لیکن فوراً ہی اُسنے کچھ سوچ کر کہا "یہ کیا بات ہے منٹو — عورت پھل پھول سے کیوں ڈرتی ہے — کیا اس لئے کہ یہ گناہ کا ہوتا ہے؟ مگر یہ گناہ اور ثواب کی بکواس کیا ہے۔ ایک نوٹ اصلی یا جعلی ہو سکتا ہے۔ ایک بچہ حلال کا یا حرام کا نہیں ہو سکتا۔ جھٹکہ یا کلمہ پڑھ کے چھری پھیرنے سے پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی پیدائش کا موجب تو وہ عظیم الشان دیوانگی ہے جس کے مرتکب سب سے پہلے باوا آدم اور اماں حوا ہوئے تھے — آہ، یہ دیوانگی!"

اور وہ دیر تک اپنی مختلف دیوانگیوں کی باتیں کرتا رہا۔

شیام بہت بلند بانگ تھا۔ اُس کی ہر بات، اس کی ہر حرکت، اس کی ہر ادا اونچے سروں میں ہوتی تھی۔ اعتدال کا وہ بالکل قائل نہیں تھا۔ محفل میں سنجیدگی و متانت کی ٹوپی پہن کر بیٹھنا اس کے نزدیک مسخرہ پن تھا۔ شغلِ مے نوشی کے دوران میں خاص طور پر اگر کوئی خاموش ہو جاتا یا فلسفی بن جاتا۔ تو اُسے ناقابلِ بیان کوفت ہوتی۔ اس قدر جھنجھلا جاتا کہ بعض اوقات بوتل اور گلاس توڑ پھوڑ کر گالیاں دیتا محفل سے باہر چلا جاتا۔

پونے کا ایک واقعہ ہے۔ شیام اور مسعود پرویز دونوں زبیدہ کا ٹیج "میں رہتے تھے۔ ایک کہانی فروخت کرنے کے سلسلے میں مجھے وہاں ٹھہرنا پڑا۔ مسعود طبعاً خاموشی پسند ہے۔ شراب پی کر وہ اور بھی زیادہ منجمد ہو جاتا۔ ایک دن صبح سے

رم کا دَور شروع ہوا۔ اس دوران میں کئی آئے اور بہک کر چلے گئے۔ میں مسعود اور شیام ڈٹے ہوئے تھے۔ شیام بہت خوش تھا۔ اس لیے کہ وہ بہکنے والوں سے مل کر جی بھر کے شور مچاتا رہا تھا۔ آخر شام کے قریب اُس کو دفعتہً محسوس ہوا کہ مسعود دن کی تمام ہاؤ ہُو سے الگ تھلگ رہا ہے۔ نشے سے چوُر آنکھوں کو سکیڑ کر اُس نے مسعود کی طرف دیکھا اور طنزیہ لہجے میں کہا "کیوں حضرتِ پرویز — کیا آپ نے اپنا مرثیہ مکمل فرما لیا ہے"

مسعود حسبِ عادت مسکرا دیا۔ اتنے میں کرشن چندر آ گیا۔ اور شیام مسعود کی منجمد مسکراہٹ کے پیدا کردہ اثر کو بھول گیا۔ دو ایک دَور چلے۔ تو شیام نے کرشن سے مسعود کے "ناقابلِ برداشت انجماد" کا ذکر کیا۔ کرشن کی زبان کا تالا کھولنے کے لئے دو پیگ کافی تھے چنانچہ مسعود سے مخاطب ہو کر اس نے لعن طعن شروع کر دی "تم کیسے شاعر ہو پرویز — صبح سے پی رہے ہو اور تم نے ابھی تک کوئی واہیات بات نہیں کی۔ خدا کی قسم جو شاعر واہیات بکواس کرنا نہیں جانتا۔ وہ شاعری بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے حیرت ہے کہ تم شاعری کیسے کر لیتے ہو۔ میرا یہ خیال ہے تمہاری یہ شاعری یقیناً بکواس ہوگی۔ اور تمہارا پی کر یوں کیسٹر آئل کی بوتل بن جانا تمہاری اصل شاعری ہے"

یہ سن کر شیام اس قدر ہنسا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے جب کچھ دیر تک مسعود سے چھیڑ جاری رہی تو وہ اٹھا۔ اٹھ کر اُس نے ہم سب کے گلاس خالی کر دیئے۔ اور کہا "چلو باہر چلیں"

ہم باہر نکلے مسعود کے کہنے پر سب نے اپنے جوتے اتار کر جیبوں میں رکھ لئے

اور دوڑنے لگے۔ اس وقت رات کے بارہ بجے ہوں گے۔ پُونہ کی سڑکیں سب سنسان تھیں۔ میں، مسعود، شیام اور ایک اور جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ دیوانہ وار شور مچاتے دوڑ رہے تھے۔ بالکل بے مطلب! اپنی منزل سے ناآشنا۔

راستے میں کرشن چندر کا مکان پڑتا تھا۔ وہ دوڑ سے پہلے ہم سے الگ ہو کر چلا گیا تھا۔ دروازہ کھلوا کر ہم نے اُسے بہت پریشان کیا۔ اُس کی ثمینہ خاتون ہمارا شور سن کر دوسرے کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس سے کرشن اور بھی زیادہ پریشان ہوا جس کے پیشِ نظر ہم وہاں سے رخصت ہوئے اور پھر سڑک پیمائی شروع کر دی۔

پونہ مندروں کا شہر ہے۔ ہر فرلانگ پر ایک نہ ایک مندر ضرور ہوتا ہے مسعود نے ایک کا گھنٹہ بجایا میں اور شیام سجدے میں چلے گئے اور شوشمبھو شوشمبھو کہنے لگے۔ اس کے بعد جو بھی مندر آتا۔ ہم چاروں یہی عمل دہراتے اور خوب قہقہے لگاتے جب کوئی پجاری آنکھیں ملتا باہر نکلتا۔ تو خاموش ہو جاتے اور چپ چاپ چل پڑتے۔

اسی طرح تین بج گئے —— ایک سڑک میں کھڑے ہو کر مسعود نے وہ مغلظات بکیں کہ میں دنگ رہ گیا۔ کیونکہ اس کی زبان سے میں نے کبھی ناشائستہ کلمہ نہیں سنا تھا مگر جب وہ موٹی موٹی گالیاں اُگل رہا تھا۔ تو میں نے محسوس کیا کہ وہ اسکی زبان پر ٹھیک طور پر بیٹھی نہیں تھیں۔

چار بجے ہم زبیدہ کاٹیج پہنچے اور سو گئے۔ لیکن مسعود شاید جاگتا اور شعر کہتا رہا تھا۔

مے نوشی کے معاملے میں بھی شیام اعتدال پسند نہیں تھا۔ وہ کھل کھیلنے

کا قائل تھا۔ مگر اپنے سامنے میدان کی وسعت دیکھ لیتا تھا۔ اُس کی لمبائی چوڑائی کو اچھی طرح جانچ لیتا تھا۔ تاکہ حدود سے آگے نکل نہ جائے۔ وہ مجھ سے کہا کرتا تھا۔

"میں چوکے پسند کرتا ہوں ـــــ چھکے محض اتفاق سے لگ جاتے ہیں"۔

ایک چھکا ملاحظہ ہو،

تقسیم ہونے سے چند ماہ پیشتر کا ذکر ہے ـــــ شیام، شاہد لطیف کے گھر سے میرے یہاں چلا آیا تھا۔ بمبئی کی زبان میں کڑکی یعنی مفلسی کے دن تھے مگر مے نوشی بڑی باقاعدگی سے جاری تھی۔ ایک شام باتوں باتوں میں زیادہ پی گئے راجہ مہدی علی خاں بھی اتفاق سے موجود تھا۔ کرفیو کا وقت ہوا۔ تو اُس نے اجازت چاہی میں نے اُس سے کہا۔ "پاگل ہوئے ہو پکڑ لئے جاؤ گے"۔

شیام نے اُس سے ازراہِ مذاق کہا "یہیں سو جاؤ۔ آج کل تاجی یہاں نہیں ہے"

راجہ نے مسکرا کر جواب دیا "مجھے نیند نہیں آئے گی۔ سپرنگ والے پلنگوں پر میں قطعاً سو نہیں سکتا۔"

شیام نے ایک گلاس میں راجہ کے ڈیل ڈول کے مطابق برانڈی کا پگ ڈالا اور اس کو دے دیا "یہ لو۔ اس سے نیند آجائے گی"۔

راجہ ایک جرعے میں سارا گلاس چڑھا گیا۔ بہت دیر تک تاجی کی باتیں ہوتی رہیں۔ جو شیام سے ناراض ہو کر اپنی بہن کے پاس چلی گئی تھی ـــــ ہر آٹھویں دسویں روز ننھی ننھی باتوں پر دونوں میں چخ ہو جاتی تھی۔ میں بالکل دخل نہیں دیتا تھا اس لئے شیام کو یہ بالکل پسند نہیں تھا ہم دونوں میں گویا دل ہی دل میں

یہ معاہدہ ہو چکا تھا۔ کہ ایک دوسرے کے کاموں میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔

تاجی یوں گئی تھی جیسے کبھی واپس نہ آئے گی۔ اور شیام نے بھی اُسے یوں وداع کیا تھا جیسے وہ پھر کبھی اس کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہیں ہو گا۔ مگر دونو ایک دوسرے سے دُور بیٹھے تڑپتے رہتے تھے۔ شاموں کو تو شیام اکثر تاجی کے معاملے میں بہت جذباتی ہو جاتا تھا۔ میں سوچتا کہ وہ ضرور رات بھر اس کی یاد میں جاگتا رہے گا۔ مگر کم بخت نیند کا کچھ ایسا ماتا تھا کہ پلنگ پر لیٹتے ہی سو جاتا۔

میرے فلیٹ میں صرف دو کمرے تھے۔ ایک سونے کا دوسرا بیٹھنے کا۔ سونے والا کمرہ میں نے شیام اور تاجی کو دے دیا تھا۔ اور بیٹھنے والے کمرے میں گدا بچھا کر میں سوتا تھا۔ تاجی چونکہ موجود نہیں تھی۔ اس لئے اس کا پلنگ راجہ مہدی علیخاں کو مل گیا۔ رات بہت گذر گئی تھی۔ اس لئے ہم سب اپنی اپنی جگہ پر سو گئے۔

حسبِ معمول پونے چھ کے قریب میری آنکھ کھلی۔ نیم خوابی کے عالم میں یوں محسوس ہوا۔ کہ میرے ساتھ کوئی لیٹا ہے۔ پہلے میں نے خیال کیا۔ کہ بیوی ہے مگر وہ تو لاہور بیٹھی تھی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ شیام ہے۔ اب میں نے سوچنا شروع کیا۔ کہ یہ کیسے میرے پاس پہنچ گیا۔ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ جلتے ہوئے کپڑے کی بُو ناک میں گھسی۔ پاس ہی صوفہ پڑا تھا۔ عرصہ ہوا سگرٹ گرنے سے اسکا ایک حصّہ جل گیا تھا۔ مگر اتنی دیر کے بعد اب بو آنا کیا مطلب ہے۔ آنکھیں زیادہ کھلیں۔ تو میں نے دھوئیں کی کڑواہٹ محسوس کی۔ اور ہلکے ہلکے دودھیا بادل بھی دیکھے ـــ اُٹھ کر میں دوسرے کمرے میں گیا کیا دیکھتا ہوں کہ وہ پلنگ جس پر شیام سویا کرتا تھا۔ سُلگ رہا ہے۔ اور پاس ہی دوسرے پلنگ پر راجہ مہدی علیخان

اپنی توند نکالے پڑا خراٹے لے رہا ہے۔

میں نے قریب جا کر پلنگ کے جلے ہوئے حصّہ کا معائنہ کیا۔ میٹرس میں بڑی رکابی کے برابر سوراخ تھا جس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے آگ بجھانے کی کوشش کی ہے کیونکہ پلنگ پانی میں تر بتر تھا مگر معاملہ چونکہ روئی اور ناریل کے پھوس کا تھا۔ اس لئے آگ پوری طرح بجھی نہیں تھی۔ اور برابر سلگ رہی تھی۔ میں نے راجہ کو جگانے کی کوشش کی۔ مگر وہ کروٹ بدل کر اور زور سے خراٹے لینے لگا۔ ایک دم پلنگ کے سیاہ سوراخ سے ایک لال لال شعلہ باہر لپکا۔ میں فوراً غسل خانے کی طرف بھاگا۔ ایک بالٹی پانی کی اس سوراخ میں ڈالی۔ اور جب پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ آگ بجھ گئی ہے۔ تو راجہ کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ اس سے جب آتشزدگی کی واردات کے متعلق استفسار کیا۔ تو اُس نے اپنے مخصوص لہجہ انداز میں خوب نمک مرچ لگا کر واقعات بیان کئے "تمہارا یہ شیام ہنومان مہاراج ہے۔ رات برانڈی کے تالاب میں غوطہ لگاتے ہوئے میں سو گیا۔ دو بجے کے قریب جب عجیب عجیب آوازیں آئیں۔ تو میں جاگ پڑا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ شیام ایک بہت بڑا ہنومان ہے۔ اُس کی گپھے دار دُم کے ساتھ مٹی کے تیل میں ڈوبی چندیاں بندھی ہیں اور اُن میں آگ لگی ہے۔ شیام پلنگ پر زور زور سے اچھل کود رہا ہے اور اپنی دُم سے آگ لگا رہا ہے۔ جب آگ لگ گئی تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور برانڈی کے تالاب میں غوطہ لگا گیا۔ تہہ کے ساتھ لگ کر سونے ہی والا تھا۔ کہ مجھے تمہارا خیال آیا ہے کہ غریب آدمی کا پلنگ ایسا نہ ہو کہ جل کر راکھ ہو جائے۔ چنانچہ اٹھا شیام غائب تھا۔ دوسرے کمرے میں تمہیں حالات سے آگاہ کرنے کے لئے گیا۔ تو کیا

دیکھتا ہوں۔ کہ شیام اپنے اصلی روپ میں تمہارے ساتھ چمٹ کر لیٹا ہے میں نے تمہیں جگانے کی کوشش کی۔ اپنے پھیپھڑوں پر زور لگا کر تمہیں پکارا۔ گھنٹے بجائے ایٹم بم چلائے۔ مگر تم نہ اُٹھے۔ آخر میں نے ہولے ہولے تمہارے کان میں کہا۔ خواجہ اُٹھو اسکاچ وسکی کی ایک پوری پیٹی آئی ہے۔ تم نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ اور پوچھا "کہاں "— میں نے کہا۔ "ہوش میں آؤ — سارا مکان جل رہا ہے — آگ لگ گئی ہے آگ! تم نے کہا۔ "بکتے ہو!" میں نے کہا۔ "نہیں خواجہ۔ میں خواجہ خضر کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ آگ لگی ہے"۔ جب تمہیں میرے بیان پر یقین آگیا۔ تو تم آرام سے یہ کہتے ہوئے سو گئے "فائر بریگیڈ کو اطلاع دے دو"۔ تمہاری طرف سے مایوس ہو کر میں نے شیام کو حالات کی نزاکت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ جب وہ اس قابل ہوا کہ میری بات اس کے دماغ تک پہنچ سکے۔ تو اس نے مجھ سے کہا۔ "تم بجا دو نا یار۔ کیوں تنگ کرتے ہو"— اور سو گیا۔ . . آگ آخر آگ ہے اور اس کا بجھانا ہر انسان کا فرض ہے۔ اس لئے میں فوراً۔ . . اپنی ساری انسانیت مجتمع کر کے فائر بریگیڈ بن گیا اور وہ جگ جو میں نے تمہاری سالگرہ پر تحفے کے طور پر دیا تھا بھر کے آگ پر ڈال دیا — میرا کام چونکہ پورا ہو چکا تھا۔ نتیجہ خدا کے ہاتھ سونپ کر سو گیا۔"

شیام جب پوری نیند سو کر اُٹھا تو میں نے اور راجہ نے اس سے پوچھا کہ آگ کیسے لگی تھی شیام کو قطعاً معلوم نہیں تھا۔ بہت دیر غور و فکر کے بعد اس نے کہا "میں آتشزدگی کی اس واردات پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا"۔ مگر جب راجہ دوسرے کمرے سے شیام کی جلی ہوئی ریشمی قمیص اٹھا کر لایا۔ تو شیام نے مجھ سے کہا۔ "اب

تفتیش کرنی ہی پڑے گی"۔

سب نے مل کر تفتیش کی تو معلوم ہوا۔ کہ شیام صاحب نے جو بنیان پہنا تھا وہ بھی دو ایک جگہ سے جلا ہوا ہے۔ زیادہ گہرائیوں میں گئے تو دیکھا کہ ان کی چھاتی پر روپے روپے جتنے دو بڑے آبلے ہیں۔ چنانچہ شرلک ہومز نے اپنے دست واٹسن سے کہا۔ یہ بات قطعی طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ آگ ضرور لگی تھی۔ اور شیام صرف اس غرض سے کہ اس کے ہمسائے راجہ مہدی علی خاں کو تکلیف نہ ہو چپ چاپ اٹھ کر میرے پاس چلا آیا"۔

جب شیام نے تہذیب و تمدن کے مروّجہ قوانین کے پیشِ نظر تاجی سے باقاعدہ شادی کی۔ تو میرا خیال ہے۔ صرف ایک انتقامی جذبے کے تحت اُس نے اتنی شاندار دعوت کی۔ کہ دیر تک فلمی دنیا میں اس کے چرچے رہے۔ اتنی شراب بہائی گئی۔ کہ خم کے خم خالی ہو گئے۔ مگر افسوس کہ تہذیب و تمدن کی ستر پوش چولی کے داغ دھل نہ سکے۔

شیام صرف بوتل اور عورت ہی کا رسیا نہیں تھا۔ زندگی میں جتنی نعمتیں موجود ہیں۔ وہ ان سب کا عاشق تھا۔ اچھی کتاب سے بھی وہ اسی طرح پیار کرتا تھا جس طرح ایک اچھی عورت سے کرتا تھا۔ اس کی ماں اس کے بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ مگر اس کو اپنی سوتیلی ماں سے بھی ویسی ہی محبت تھی۔ جو حقیقی ماں سے ہو سکتی ہے اس کے چھوٹے چھوٹے سوتیلے بہن بھائی تھے۔ ان سب کو وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ باپ کی موت کے بعد صرف اس کی اکیلی جان تھی۔ جو اتنے بڑے کنبے کی دیکھ بھال کرتی تھی۔

ایک عرصے تک وہ انتہائی خلوص کے ساتھ دولت اور شہرت حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ اس دوران میں تقدیر نے اُسے کئی "غچّے" دئے مگر وہ ہنستا رہا "جانِ من ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ تو میری بغل میں ہوگی" اور وہ کئی برسوں کے بعد آخر آہی گیا۔ کہ دولت اور شہرت دونوں اس کی جیت میں تھیں۔

موت سے پہلے اُس کی آمدنی ہزاروں روپے ماہوار تھی۔ بمبئی کے مضافات میں ایک خوبصورت بنگلہ اس کی ملکیت تھا اور کبھی وہ دن تھے کہ اس کے پاس سر چھپانے کو جگہ نہیں تھی۔ مگر مفلسی کے ان ایام میں بھی وہی ہنستا ہوًا شیام تھا۔ دولت و شہرت آئی تو اس نے ان کا یوں استقبال کیا جس طرح لوگ ڈپٹی کمشنر کا کرتے ہیں۔ یہ دونوں محترمائیں اس کے پاس آئیں۔ تو اس نے ان کو اپنی لوہے کی چارپائی پر بٹھا لیا، اور پٹاخ پٹاخ بوسے داغ دئے۔

میں اور وہ جب ایک چھت کے نیچے رہتے تھے تو دونوں کی حالت پتلی تھی۔ فلم انڈسٹری ملک کی سیاسیات کی طرح ایک بڑے ہی نازک دَور سے گذر رہی تھی۔ میں بمبئی ٹاکیز میں ملازم تھا۔ اس کا وہاں ایک پکچر کا کنٹریکٹ تھا دس ہزار روپے میں عرصے کی بیکاری کے بعد اس کو یہ کام ملا تھا۔ مگر وقت پر پیسے نہیں ملتے تھے۔ بہرحال ہم دونوں کا گذر کسی نہ کسی طرح ہو جاتا تھا۔ میاں بیوی ہوتے تو اُن میں روپے پیسے کے معاملے میں ضرور رنج ہوتی۔ مگر شیام اور مجھے کبھی محسوس تک نہ ہوا۔ کہ ہم میں سے کون خرچ کر رہا ہے اور کتنا کر رہا ہے۔

ایک دن اُسے بڑی کوششوں کے بعد موٹی سی رقم ملی (غالباً پانچ سو روپے تھے)

میری جیب خالی تھی۔ ہم ملاڈ سے گھر آ رہے تھے۔ راستے میں شیام کا یہ پروگرام بن گیا کہ وہ چرچ گیٹ کسی دوست سے ملنے جائے گا۔ میرا اسٹیشن آیا تو اُس نے جیب سے دس دس روپے کے نوٹوں کی گڈی نکالی۔ آنکھیں بند کر کے اس کے دو حصے کئے اور مجھ سے کہا "جلدی کرو منٹو ——— ان میں سے ایک لے لو۔"

میں نے گڈی کا ایک حصہ پکڑ کر جیب میں ڈال لیا۔ اور پلیٹ فارم پر اتر گیا شیام نے مجھے "ٹاٹا" کہا۔ اور کچھ نوٹ جیب سے نکال کر لہرائے "تم بھی کیا یاد رکھو گے سیفٹی کی خاطر میں نے یہ نوٹ علیحدہ رکھ لئے تھے ——— ہپ ٹلّا!"

شام کو جب وہ اپنے دوست سے مل کر آیا۔ تو کباب ہو رہا تھا۔ مشہور فلم اسٹار "کے کے" نے اس کو بلایا تھا۔ کہ وہ اس سے ایک پرائیویٹ بات کرنا چاہتی ہے شیام نے برانڈی کی بوتل بغل میں سے نکال کر اور گلاس میں ایک بڑا پیگ ڈال کر مجھ سے کہا "پرائیویٹ بات یہ تھی۔ . . . میں نے لاہور میں ایک دفعہ کسی سے کہا تھا کہ "کے کے" مجھ پر مرتی ہے، خدا کی قسم بہت بُری طرح مرتی تھی۔ لیکن ان دنوں میرے دل میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ آج اس نے مجھے اپنے گھر بلا کر کہا۔ کہ تم نے بکواس کی تھی میں تم پر کبھی نہیں مری۔ میں نے کہا تو آج مر جاؤ مگر اس نے ہٹ دھرمی سے کام لیا۔ اور مجھے غصے میں آ کر اس کے ایک گھونسہ مارنا پڑا"

میں نے اس سے پوچھا "تم نے ایک عورت پر ہاتھ اُٹھایا"

شیام نے مجھے اپنا ہاتھ دکھایا جو زخمی ہو رہا تھا "کم بخت آگے سے ہٹ گئی۔ نشانہ چوکا اور میرا گھونسہ دیوار کے ساتھ جا ٹکرایا۔"

یہ کہہ کر وہ خوب ہنسا "سالی بیکار تنگ کر رہی ہے!"

میں نے اوپر روپے پیسے کا ذکر کیا ہے ۔ غالباً دو برس پہلے کی بات ہے میں یہاں لاہور میں فلمی صنعت کی زبوں حالی اور اپنے افسانے "ٹھنڈا گوشت" کے مقدمے کی وجہ سے بہت پریشان تھا عدالت ماتحت نے مجھے مجرم قرار دے کر تین مہینے قید بامشقت اور تین سو روپیہ جرمانے کی سزا دی تھی میرا دل اس قدر کھٹا ہو گیا تھا۔ کہ جی چاہتا تھا۔ اپنی تمام تصانیف کو آگ میں جھونک کر کوئی اور کام شروع کر دوں۔ جس کا تخلیق سے کوئی علاقہ ہو ۔ چنگی کے محکمے میں ملازم ہو جاؤں اور رشوت کھا کر اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالا کروں۔ کسی پر نکتہ چینی کروں نہ کسی معاملے میں اپنی رائے دوں۔

ایک عجیب و غریب دور سے میرا دل و دماغ گزر رہا تھا۔ بعض لوگ سمجھتے تھے کہ افسانے لکھ کر ان پر مقدمے چلوانا پیشہ ہے۔ بعض کہتے تھے کہ میں صرف اس لئے لکھتا ہوں کہ سستی شہرت کا دلدادہ ہوں اور لوگوں کے سفلی جذبات مشتعل کر کے اپنا الو سیدھا کرتا ہوں۔ مجھ پر چار مقدمے چل چکے ہیں ان چار الوؤں کو سیدھا کرنے میں جو خم میری کمر میں پیدا ہوا۔ اس کو کچھ میں ہی جانتا ہوں۔

مالی حالت کچھ پہلے ہی کمزور تھی۔ آس پاس کے ماحول نے جب نکما کر دیا تو آمدنی کے محدود ذرائع اور بھی سکڑ گئے۔ ایک صرف مکتبہ جدید لاہور کے چودھری برادران تھے جو مقدور بھر میری امداد کر رہے تھے۔ غم غلط کرنے کے لئے جب میں نے کثرت سے شراب نوشی شروع کی۔ تو انہوں نے چاہا کہ اپنا ہاتھ روک لیں۔ مگر وہ اتنے مخلص تھے کہ مجھے ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔

اس زمانے میں میری کسی سے خط وکتابت نہیں تھی۔ دراصل میرا دل بالکل اُچاٹ ہو چکا تھا۔ اکثر گھر سے باہر رہتا۔ اور اپنے شرابی دوستوں کے گھر پڑا رہتا جن کا ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ ان کی صحبت میں رہ کر میں جسمانی و روحانی خودکشی کی کوشش میں معروف تھا۔

ایک دن مجھے کسی اور کے گھر کے پتے سے ایک خط ملا۔ تحسین پکچرز کے مالک کی طرف سے تھا۔ لکھا تھا کہ میں فوراً ملوں۔ بمبئے سے انہیں میرے بارے میں کوئی ہدایت موصول ہوئی ہے۔ صرف یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ ہدایت بھیجنے والا کون ہے۔ میں تحسین پکچرز والوں سے ملا۔ معلوم ہوا کہ بمبئے سے شیام کے پے در پے انہیں کئی تار ملے ہیں کہ مجھے ڈھونڈ کر ۵۰۰ روپے دے دیئے جائیں۔ میں جب دفتر میں پہونچا۔ تو وہ شیام کے تازہ تاکیدی تار کا جواب لکھ رہے تھے۔ کہ تلاشِ بسیار کے باوجود انہیں منٹو نہیں مل سکا۔

میں نے ۵۰۰ روپے لے لئے۔ اور میری مخمور آنکھوں میں آنسو آگئے

میں نے بہت کوشش کی۔ کہ شیام کو خط لکھ کر اس کا شکریہ ادا کروں اور پوچھوں گا اس نے مجھے یہ ۵۰۰ روپے کیوں بھیجے تھے کیا اس کو علم تھا۔ کہ میری مالی حالت کمزور ہے۔ اس غرض سے میں نے کئی خط لکھے اور پھاڑ دئے ایسا محسوس ہوتا کہ میرے لکھے ہوئے الفاظ شیام کے اُس جذبے کا منہ چڑا رہے ہیں جس کے زیر اثر اُس نے مجھے یہ روپے روانہ کئے تھے

پچھلے سال جب شیام اپنے ذاتی فلم کی نمائش کے سلسلے میں امرتسر آیا تو تھوڑی دیر کے لئے لاہور بھی آگیا۔ یہاں اس نے بہت سے لوگوں سے میرا

اتا پتا پوچھا۔ مگر اس دوران میں اتفاق سے مجھے ہی معلوم ہو گیا۔ کہ وہ لاہور میں موجود ہے۔ میں اسی وقت دوڑا اس سنیما پہنچا۔ جہاں وہ ایک دعوت کھا کے آ رہا تھا۔

میرے ساتھ رشید عطرے تھا۔ شیام کا پونے کا پرانا دوست۔ جب موٹر صحن میں داخل ہوئی تو شیام نے مجھے اور رشید کو دیکھ لیا۔ ایک زور کا نعرہ اُس نے بلند کیا۔ اس نے ڈرائیور سے موٹر روکنے کے لئے بہت کہا۔ مگر اس کے استقبال کے لئے اس قدر ہجوم تھا کہ ڈرائیور نہ رُکا موٹر سے نکل کر پولیس کی مدد سے شیام اور ادم ایک ہی قسم کا لباس اور سر پر سفید پانامہ ہیٹ پہنے سنیما کے اندر پچھلے دروازے سے داخل ہوئے۔ بڑے دروازے سے ہم اندر پہنچے۔ شیام — وہی شیام تھا۔ مسکراتا، ہنستا اور قہقہے لگاتا شیام۔

دوڑ کر ہم دونوں سے لپٹ گیا۔ پھر اس قدر شور مچا۔ کہ ہم میں سے کوئی بھی مطلب کی بات نہ کر سکا۔ اوپر تلے اتنی باتیں ہوئیں کہ انبار لگ گئے اور ہم ان کے نیچے دب کے رہ گئے۔ سنیما سے فارغ ہو کر اُسے ایک فلم ڈسٹری بیوٹر کے دفتر میں جانا تھا۔ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ یہاں جو بات بھی شروع ہوتی، فوراً کٹ جاتی۔ لوگ دھڑا دھڑ آ رہے تھے نیچے بازار میں ہجوم شور برپا کر رہا تھا۔ کہ شیام درشن دینے کے لئے باہر بالکنی میں آئے۔

شیام کی حالت عجیب و غریب تھی۔ اس کو لاہور میں اپنی موجودگی کا شدید احساس تھا۔ اس لاہور میں جس کی متعدد سڑکوں پر اُس کے زمانوں

کے چھینٹے بکھرا کرتے تھے۔ اس لاہور میں جس کا فاصلہ اب امرتسر سے ہزاروں میل ہو گیا تھا۔ اور اس کا راولپنڈی کہاں تھا۔ جہاں اُس نے اپنے لڑکپن کے دن گذارے تھے؟ لاہور، امرتسر اور راولپنڈی، سب اپنی اپنی جگہ پر تھے مگر وہ دن نہیں تھے۔ وہ راتیں نہیں تھیں جو شیام یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ سیاست کے گورکن نے انہیں نہ معلوم کہاں دفن کر دیا تھا۔

شیام نے مجھ سے کہا۔ میرے ساتھ رہو مگر اس کے دل و دماغ کی مضطرب کیفیت کے احساس نے مجھے سخت پراگندہ کر دیا۔ اُس سے یہ وعدہ کر کے کہ رات کو اس سے فلیٹی ہوٹل میں ملوں گا چلا گیا۔

شام سے اتنی دیر کے بعد ملاقات ہوئی تھی مگر خوشی کے بجائے ایک عجیب قسم کی گھٹی گھٹی کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ طبیعت میں اس قدر جھنجلاہٹ تھی کہ جی چاہتا تھا کسی سے زبردست لڑائی ہو جائے۔ خوب مار کٹائی ہو اور میں تھک کر سو جاؤں۔ گھٹن کا تجزیہ کیا تو کہاں کا کہاں پہنچ گیا۔ ایک ایسی جگہ جہاں خیالات کے سائے دھاگے بُری طرح آپس میں اُلجھ گئے۔ اس سے طبیعت اور بھی جھنجلا گئی۔ اور فلیٹیز میں جا کر میں نے ایک دوست کے کمرے میں پینا شروع کر دی۔

نو ساڑھے نو کے قریب شور سننے پر معلوم ہوا کہ شیام آ گیا ہے۔ اسکے کمرے میں ملنے والوں کی ویسی ہی بھیڑ تھی۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھا۔ مگر کھل کر کوئی بات نہ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہم دونوں کے جذبات میں تالے لگا کر چابیاں کسی نے ایک بہت بڑے گچھے میں پرو دی تھیں۔ ہم دونوں اکس

گچھے میں سے ایک ایک چابی نکال کر یہ تالے کھولنے کی کوشش کرتے اور ناکام رہتے تھے۔

میں اُکتا گیا۔ ڈنر کے بعد شیام نے بڑی جذباتی قسم کی تقریر کی۔ مگر میں نے اس کا ایک لفظ تک نہ سنا۔ میرا اپنا دماغ بڑے اونچے سروں میں جانے کیا بک رہا تھا۔ شیام نے اپنی بکواس ختم کی۔ تو لوگوں نے بھرے پیٹ کیساتھ تالیاں پیٹیں۔ میں اُٹھ کر کمرے میں چلا آیا۔ وہاں فضلی بیٹھے تھے۔ ان سے ایک معمولی بات پر بحث ہو گئی۔ شیام آیا تو اُس نے کہا "یہ سب لوگ ہیرا منڈی جا رہے ہیں۔ چلو آؤ تم بھی چلو"۔

میں قریب قریب رو دیا "میں نہیں جاتا۔ تم جاؤ اور تمہارے یہ لوگ جائیں"۔

"تو میرا انتظار کرو ۔۔۔ میں ابھی آیا"۔

یہ کہہ کر شیام ہیرا منڈی جانے والی پارٹی کے ساتھ چلا گیا۔ میں نے شیام کو اور فلمی صنعت سے متعلق تمام لوگوں کو موٹی موٹی گالیاں دیں۔ اور فضلی سے کہا "میرا خیال ہے۔ آپ تو یہاں انتظار کریں گے۔ اگر تکلیف نہ ہو تو از راہِ کرم اپنی موٹر میں مجھے میرے گھر تک چھوڑ آئیے"۔

رات بھر اوٹ پٹانگ خواب دیکھتا رہا۔ شیام سے کئی مرتبہ لڑائی ہوئی صبح دودھ والا آیا۔ تو میں کھوکھلے غصے میں اُس سے کہہ رہا تھا "تم بالکل بدل گئے ہو۔ ۔ ۔ اُلّو کے پٹھے، کمینے، ذلیل۔ ۔ ۔ ۔ تم ہندو ہو!"

نیند کھلی تو میں نے محسوس کیا۔ کہ میرے منہ سے ایک بہت بڑی

گالی نکل گئی ہے۔ لیکن جب میں نے خود کو اچھی طرح ٹٹولا۔ تو یقین ہوگیا۔ کہ وہ میرا منہ نہیں تھا۔ سیاست کا بھونپو تھا جس سے یہ گالی نکلی تھی۔ اس کے متعلق سوچتے ہوئے میں نے دودھ والے سے دودھ لیا جس میں ایک چوتھائی پانی تھا۔ اس خیال نے مجھے بڑی ڈھارس دی۔ کہ شیام ہندو تھا۔ مگر پانی ملا ہندو نہیں تھا

عرصہ ہوا جب تقسیم پر ہندو مسلمانوں میں خونریز جنگ جاری تھی۔ اور طرفین کے ہزاروں آدمی روزانہ مرتے تھے۔ شیام اور میں راولپنڈی سے بھاگے ہوئے ایک سکھ خاندان کے پاس بیٹھے تھے۔ اس کے افراد اپنے تازہ زخموں کی روداد سنا رہے تھے۔ جو بہت دردناک تھی۔ شیام متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا وہ ہلچل جو اُس کے دل و دماغ میں مچ رہی تھی۔ اس کو میں بخوبی سمجھتا تھا جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو میں نے شیام سے کہا "میں مسلمان ہوں، کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ مجھے قتل کردو"

شیام نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا "اس وقت نہیں —— لیکن اُس وقت جبکہ میں مسلمانوں کے ڈھائے ہوئے مظالم کی داستان سن رہا تھا —— میں تمہیں قتل کرسکتا تھا"

شیام کے منہ سے یہ سن کر میرے دل کو زبردست دھکا لگا۔ اس وقت شاید میں بھی اُسے قتل کر سکتا۔ مگر بعد میں جب میں نے سوچا اور اس وقت اور اس وقت میں زمین و آسمان کا فرق محسوس کیا۔ تو ان تمام فسادات کا نفسیاتی پس منظر میری سمجھ میں آگیا۔ جس میں روزانہ سینکڑوں بے گناہ ہندو اور مسلمان موت کے گھاٹ اتارے جا رہے تھے۔

اس وقت نہیں —— اُس وقت ہاں۔ ۔ ۔ کیوں ؟ آپ سوچیے تو آپ کو اس کیوں کے پیچھے انسان کی فطرت میں اس سوال کا صحیح جواب مل جائیگا۔

بمبئی میں بھی فرقہ دارانہ کشیدگی دن بدن بڑھتی چلی جارہی تھی بمبے ٹاکیز کی عنانِ حکومت جب اشوک اور واچا نے سنبھالی۔ تو بڑے بڑے عہدے اتفاق سے مسلمانوں کے ہاتھ میں چلے گئے۔ اس سے بمبے ٹاکیز کے ہندو اسٹاف میں نفرت اور غصے کی لہر دوڑ گئی۔ واچا کو گمنام خط موصول ہونے لگے جس میں اسٹوڈیو کو آگ لگانے اور مرنے مارنے کی دھمکیاں ہوتی تھیں۔ اشوک اور واچا دونوں کو ان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ لیکن کچھ ذکی الحس ہونے کی باعث اور کچھ مسلمان ہونے کی وجہ سے میں حالات کی نزاکت کو بہت زیادہ اہمیت دے رہا تھا کئی مرتبہ میں نے اشوک اور واچا سے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ اور ان کو رائے دی کہ وہ مجھے بمبے ٹاکیز سے الگ کر دیں۔ کیونکہ ہندو یہ سمجھتے تھے کہ صرف میری وجہ سے مسلمان وہاں داخل ہو رہے ہیں۔ مگر انہوں نے کہا۔ کہ میرا دماغ خراب ہے۔

دماغ میرا واقعی خراب ہو رہا تھا۔ بیوی بچے پاکستان میں تھے۔ جب وہ ہندوستان کا ایک حصہ تھا۔ تو میں اُسے جانتا تھا۔ اس میں وقتاً فوقتاً جو ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے تھے۔ میں ان سے بھی واقف تھا۔ مگر اب اس خطۂ زمین کو نئے نام نے کیا بنا دیا تھا۔ اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ اپنی حکومت کیا ہوتی ہے ؟ اسکی تصویر بھی کوشش کے باوجود میرے ذہن میں نہیں آتی تھی۔

۱۴ اگست کا دن میرے سامنے بمبے میں منایا گیا۔ پاکستان اور ہندوستان دونوں آزاد ملک قرار دئے گئے تھے۔ لوگ بہت مسرور تھے۔ مگر قتل اور آگ کی

واردائیں باقاعدہ جاری تھیں۔ ہندوستان زندہ باد کے ساتھ ساتھ پاکستان زندہ باد کے نعرے بھی لگتے تھے۔ کانگرس کے ترنگے کے ساتھ اسلامی پرچم بھی لہراتا تھا۔ پنڈت جواہرلال نہرو اور قائدِ اعظم محمد علی جناح دونوں کے نعرے بازاروں اور سڑکوں میں گونجتے تھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہندوستان اپنا وطن ہے یا پاکستان۔ اور وہ لہو کس کا ہے۔ جو ہر روز اتنی بیدردی سے بہایا جاتا ہے وہ ہڈیاں کہاں جلائی یا دفن کی جائیں گی۔ جن پر سے مذہب کا گوشت پوست چیلیں اور گدھ نوچ نوچ کر کھا گئے تھے۔ اب ہم آزاد ہوئے ہیں۔ ہمارا غلام کون ہوگا —— جب غلام تھے تو آزادی کا تصور کر سکتے تھے۔ اب آزاد ہوئے ہیں تو غلامی کا تصور کیا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم آزاد بھی ہوئے ہیں یا نہیں۔

ہندو اور مسلمان دھڑا دھڑ مر رہے تھے۔ کیسے مر رہے تھے، کیوں مر رہے تھے —— ان سوالوں کے مختلف جواب تھے۔ ہندوستانی جواب پاکستانی جواب، انگریزی جواب، ہر سوال کا جواب موجود تھا۔ مگر اس جواب میں حقیقت تلاش کرنے کا سوال پیدا ہوتا۔ تو اس کا کوئی جواب نہ ملتا۔ کوئی کہتا اسے غدر کے کھنڈرات میں تلاش کرو کوئی کہتا نہیں۔ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں ملے گا۔ کوئی اور پیچھے ہٹ کر اسے مغلیہ خاندان کی تاریخ میں ڈھونڈنے کے لئے کہتا سب پیچھے ہی پیچھے ہٹتے جاتے تھے۔ اور قاتل اور سفاک برابر آگے بڑھتے جا رہے تھے اور لہو اور لوہے کی ایسی تاریخ لکھ رہے تھے جس کا جواب تاریخ عالم میں کہیں بھی نہیں ملتا۔

ہندوستان آزاد ہو گیا تھا۔ پاکستان عالم وجود میں آتے ہی آزاد ہو گیا

تھا۔لیکن انسان ان دونوں مملکتوں میں غلام تھا۔تعصب کا غلام ــــ مذہبی جنون کا غلام۔حیوانیت و بربریت کا غلام ــــ

میں نے بمبے ٹاکیز جانا چھوڑ دیا۔اشوک اور واچا آتے تو میں خرابیٔ طبیعت کا بہانہ کر دیتا۔اسی طرح کئی دن گذر گئے۔شیام مجھے دیکھتا اور مسکرا دیتا۔اس کو میری قلبی کیفیات کا بخوبی علم تھا۔کچھ دن بہت زیادہ پی کر میں نے یہ شغل بھی چھوڑ دیا تھا۔سارا دن گم سم صوفے پر لیٹا رہتا۔ایک دن شیام اسٹڈیو سے آیا۔تو اس نے مجھے لیٹا دیکھ کر مزاحیہ انداز میں کہا "کیوں خواجہ جگالی کر رہے ہو؟"

مجھے بہت جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔کہ شیام میری طرح کیوں نہیں سوچتا۔اس کے دل و دماغ میں وہ طوفان کیوں برپا نہیں ہیں جن کے ساتھ میں دن رات لڑتا رہتا ہوں۔وہ اسی طرح مسکراتا،ہنستا اور شور مچاتا رہتا۔مگر شاید وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔کہ جو فضا اس وقت گرد و پیش تھی۔اس میں سوچنا بالکل بیکار ہے میں نے بہت غور و فکر کیا۔مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔آخر تنگ آ کر میں نے کہا ہٹاؤ چلیں یہاں سے ــــ شیام کی نائٹ شوٹنگ تھی۔میں نے اپنا اسباب وغیرہ باندھنا شروع کر دیا۔ساری رات اسی میں گذر گئی صبح ہوئی تو شیام شوٹنگ سے فارغ ہو کر آیا۔اس نے میرا بندھا ہوا اسباب دیکھا۔تو مجھ سے صرف اتنا پوچھا "چلے؟"

میں نے بھی صرف اتنا ہی کہا۔"ہاں!"

اس کے بعد میرے اور اس کے درمیان ہجرت کے متعلق کوئی بات نہ ہوئی۔بقایا سامان رکھنے میں اُس نے میرا ہاتھ بٹایا۔اس دوران میں رات

کی شوٹنگ کے لطیفے بیان کرتا رہا۔ اور خوب ہنستا رہا۔ جب میرے رخصت ہونے کا وقت آیا۔ تو اُس نے الماری میں سے برانڈی کی بوتل نکالی۔ دو پیگ بنائے اور ایک مجھے دے کر کہا۔ "ہپ ٹلا"

میں نے جواب میں ہپ ٹلا کہا۔ اور اس نے قہقہے لگاتے ہوئے مجھے اپنے چوڑے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ "سؤر کہیں کے"

میں نے اپنے آنسو روکے" پاکستان کے"

شیام نے پُر خلوص نعرہ بلند کیا۔ "زندہ باد پاکستان"

"زندہ باد ہندوستان"۔ اور میں نیچے چلا گیا۔ جہاں ٹرک والا میرا انتظار کر رہا تھا۔

بندرگاہ تک شیام میرے ساتھ گیا۔ جہاز چلنے میں کافی دیر تھی۔ وہ ادھر اُدھر کے لطیفے سنا کر میرا دل بہلاتا رہا۔ جب وسل ہوا۔ تو اُس نے ہپ ٹلا کہہ کر میرا ہاتھ دبایا۔ اور گینگ وے" سے نیچے اُتر گیا۔۔۔۔ مڑ کر اُس نے میری طرف نہ دیکھا اور مضبوط قدم اُٹھاتا بندرگاہ سے باہر چلا گیا۔

میں نے لاہور پہنچ کر اس کو خط لکھا۔ انیس ایک اڑتالیس کو اسکا جواب آیا

یہاں تمہیں سب لوگ یاد کرتے ہیں۔ تمہاری اور تمہاری بذلہ سنجی کی غیر موجودگی محسوس کرتے ہیں۔ جو تم بڑی فراخدلی سے اُن پر ضائع کرتے تھے۔ واچا ابھی تک اس بات پر مُصر ہے کہ تم کنّی کترا گئے۔ اب کی دفعہ اس کو اطلاع دئے بغیر پاکستان بھاگ کر۔ عجیب ۔۔۔۔ بات ہے کہ وہ جب ٹلا کر

میں مسلمانوں کے داخلے کی مخالفت میں سب سے آگے تھا
سب سے پہلا آدمی تھا۔ جو پاکستان بھاگ کر چلا گیا۔
خود کو اپنے نظریے کا شہید بناتے ہوئے — یہ واچا
کا اپنا نظریہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم نے اُس کو ضرور
خط لکھا ہو گا۔ اگر نہیں لکھا تو فوراً لکھو کم از کم شرافت
کا یہی تقاضا ہے۔

تمہارا شیام

آج چودہ اگست ہے۔ وہ دن جب پاکستان اور ہندوستان آزاد ہوئے
تھے۔ اِدھر اور اُدھر دونوں طرف خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ
حملے اور دفاع کی تیاریاں بھی زور شور سے جاری ہیں — میں شیام کی روح
سے مخاطب ہوتا ہوں "پیارے شیام میں بمبے ٹاکیز چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ کیا
پنڈت جواہر لال نہرو کشمیر نہیں چھوڑ سکتے — ہے نا ہپ ٹلا بات؟"

چوٹی کی اداکارہ

نواب چھتاری کی صاحب زادی تسنیم سلیم ___ نے مجھے ایک خط لکھا تھا۔ تو کیا خیال ہے آپ کا اپنے بہنوئی کے متعلق ؟ جو اندازہ آپ کی طرف سے لگا کر لوٹے ہیں۔ تو مجھے اپنے لئے شادی مرگ کا اندیشہ ہوا جاتا ہے۔ اب میں آپ کو تفصیل سے بتا دوں۔ کہ یہ حضرت مجھے آپ کے نام سے چھیڑا کرتے تھے۔ کہ جب وہ میرے نادیدہ بھائی سے ملیں گے تو نہ جانے کیا کیا ..... حماقتیں سرزد ہوں گی ...... اور مجھے شرمندگی ہوگی۔ اور اب پرسوں سے مصر ہیں کہ "بھئی بمبئی چل کر منٹو سے ملو، بہت ہی دلچسپ آدمی ہیں۔" اور اس طرح کہتے ہیں گویا منٹو میرے بجائے ان کا بھائی ہے اور میں ہمیشہ کہتی تھی، کہ دیکھنا یہ حضرت کیسے نکلتے ہیں۔

...... زبردستی تو ملاحظہ کیجئے۔

بہرحال بہت خوش ہیں" کہ میرا انتخاب بہت خوب رہا.....

ہمارے برادر محترم یعنی ابن بھائی سلیم سے قبل ہی پہنچ گئے تھے۔ اور انہوں نے سب سے قبل یہی بات بتائی کہ وہ آپ سے نیاز حاصل کرکے آئے ہیں۔ نرگس کا ذکر عمداً گول کرکے باقی سب تفصیل سے بتادیا پھر جب سلیم آئے تو انہوں نے نہ صرف داستان جبہ سائی بتائی۔ بلکہ آپ کی نخشب کی جنگ کا واقعہ بھی دلچسپی سے بیان کیا اس سلسلے میں سلیم معافی خواہ ہیں، دوبارہ جدن بائی کے یہاں جانے کے محرک شمشاد بھی (جو آپ سے مل چکے ہیں) اور یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ سلیم کو اگر عشق ہوا ہے تو لیلا چٹنس سے ورنہ ایسے بدنظر بھی نہیں ——

میں بہت مصروف تھا۔ جب سلیم میرے یہاں آئے۔ ان سے میری پہلی ملاقات تھی اور بقول تسنیم کے وہ میرے بہنوئی تھے اس لئے ان کی خاطر داری کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا گھر میں جو حاضر تھا ان کی اور ان کے مصاحبوں کی خدمت میں پیش کردیا۔ فلم سے متعلق لوگوں کے پاس ایک تحفے کی چیز "شوٹنگ" ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ بھی ...... ان کو شری ساؤنڈ اسٹوڈیو میں دکھا دی گئی۔ غالباً "بھول" کی تھی جسے ڈائرکٹر دھانسو یعنی آصف بنا رہا تھا۔

سلیم اور ان کے ساتھیوں کو بظاہر مطمئن ہوجانا چاہئے تھا۔ مگر ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ وہ اپنا پروگرام بنا کر ہی پہنچے تھے۔ سلیم نے برسبیل تذکرہ مجھ سے پوچھا۔ ”کیوں صاحب نرگس کہاں ہوتی ہے آج کل؟

میں نے ازراہِ مذاق کہا۔ ”اپنی ماں کے پاس“

میرا مذاق غیر طبعی موت کی گود میں چلا گیا جب میرے مہمانوں میں سے ایک نے بڑی نوابانہ سادہ لوحی سے کہا ”جدن بائی کے پاس؟“

”جی ہاں“

سلیم نے پوچھا۔ ”کیا اس سے ملاقات ہو سکتی ہے — میرا مطلب ہے کہ میرے یہ دوست اس کو دیکھنے کے بہت مشتاق ہیں..... کیا آپ اس کو جانتے ہیں؟

میں نے جواب دیا۔ ”جانتا ہوں ..... مگر معمولی سا۔“

ایک صاحب نے بڑے بے ڈھب انداز میں سوال کیا۔

”کیوں“؟

اس لئے کہ اسے اور مجھے ابھی تک کسی فلم میں اکٹھے کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔“

سلیم نے یہ سُن کر کہا۔ تو چھوڑیئے۔ ہم آپ کو خواہ مخواہ تکلیف نہیں دینا چاہتے۔

لیکن میں خود نرگس کے ہاں جانا چاہتا تھا۔ کئی دفعہ ارادہ کیا تھا مگر اکیلا جانا مجھے پسند نہیں تھا ——————————

—————— آدمی سادہ لوح تھے۔ محض عیاشی کے طور پر نرگس کو

کو ایک نظر دیکھنا چاہتے تھے۔ تاکہ واپس اپنی جاگیروں اور ریاستوں میں جا کر اپنے دوستوں اور مصاحبوں کو مشہور فلم اسٹار نرگس کے چشم دید حالات بتائیں چنانچہ میں نے سلیم سے کہا۔ "تکلیف کی کوئی بات نہیں چلتے ہیں ممکن ہے ملاقات ہو جائے۔"

میں نرگس سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔ بمبئی میں اتنی ایکٹرسیں تھیں۔ جن کے ہاں میں جب چاہتا تھا آجا سکتا تھا۔ مگر خاص طور پر نرگس سے ملنے کا مطلب کیا تھا؟ میرا خیال ہے۔ اس کا جواب دینے سے پہلے میں آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سنا دوں۔

میں فلمستان میں ملازم تھا۔ صبح جاتا تو شام کو آٹھ کے قریب لوٹتا ایک روز اتفاق سے واپسی جلدی ہوئی یعنی میں دوپہر ہی کے قریب گھر پہنچ گیا۔ اندر داخل ہوا تو ساری فضا مرتعش نظر آئی۔ جیسے کوئی ساز کے تار چھیڑ کر خود چھپ گیا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے پاس میری دو سالیاں کھڑی بظاہر اپنے بال گوندھ رہی تھیں۔ مگر ان کی انگلیاں ہوا میں چل رہی تھیں۔ ہونٹ دونوں کے پھڑپھڑا رہے تھے۔ مگر آواز نہیں نکلتی تھی۔ دونوں مل جل کر گھبراہٹ کی ایسی تصویر پیش کر رہی تھیں جو اپنی گھبراہٹ چھپانے کی خاطر بے مطلب دوپٹہ اوڑھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ملحقہ کمرے کے دروازے کا پردہ اندر کی طرف دبا ہوا تھا۔

میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کی طرف قصور وار نگاہوں سے دیکھا۔ ہولے ہولے کچھ کھسر پھسر کی۔ پھر دونوں نے

بیک وقت کہا "بھابی سلام"

"وعلیکم السلام" میں نے غور سے ان کی طرف دیکھا "کیا بات ہے؟"

میں نے سوچا کہ سب مل کر سینما جا رہی ہیں۔ دونوں نے میرا سوال سن کر پھر کھسر پھسر کی۔ پھر ایک دم کھکھلا کر ہنسیں اور دوسرے کمرے میں بھاگ گئیں۔

میں نے سوچا کہ شاید انہوں نے اپنی کسی سہیلی کو مدعو کیا ہے وہ آنے والی ہے اور چونکہ میں غیر متوقع طور پر چلا آیا ہوں۔ اس لئے ان کا پروگرام درہم برہم ہو گیا ہے۔

دوسرے کمرے میں کچھ دیر تک تینوں بہنوں میں سرگوشیاں ہوتی رہیں۔ دبی دبی ہنسی کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ اس کے بعد سب سے بڑی بہن یعنی میری بیوی بظاہر اپنی بہنوں سے مخاطب، مگر دراصل مجھے سنانے کے لئے یہ کہتی ہوئی باہر نکلی "مجھے کیا کہتی ہو۔ کہنا ہے تو خود ان سے کہو سعادت صاحب آج بہت جلد آ گئے؟"

میں نے وجہ بیان کر دی کہ اسٹوڈیو میں کوئی کام نہیں تھا۔ اس لئے چلا آیا۔ پھر اپنی بیوی سے پوچھا۔ کیا کہنا چاہتی ہیں میری سالیاں؟"

"یہ کہنا چاہتی ہیں کہ نرگس آ رہی ہے؟"

"تو کیا ہوا —— آئے کیا وہ پہلے کبھی نہیں آئی؟"

میں سمجھا کہ وہ اس پارسی لڑکی کی بات کر رہی ہے۔ جس کی ماں نے مسلمان سے شادی کر لی تھی۔ اور ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔ مگر میری بیوی نے کہا۔

"ہائے۔ وہ پہلے کب ہمارے ہاں آئی ہے"۔

"تو کیا وہ کوئی اور نرگس ہے؟"

میں نرگس ایکٹرس کی بات کر رہی ہوں"

میں نے تعجب سے پوچھا "وہ کیا کرنے آ رہی ہے یہاں۔؟"

میری بیوی نے مجھے سارا قصہ سنایا۔ گھر میں ٹیلیفون تھا جسے تینوں بہنیں فرصت کے اوقات میں بڑی فراخدلی سے استعمال کرتی تھیں۔ جب اپنی سہیلیوں سے باتیں کرتی تھک جاتیں تو کسی ایکٹرس کا نمبر گھما دیتیں۔ وہ مل جاتی تو اس سے اوٹ پٹانگ گفتگو شروع ہو جاتی ہم آپ کی بہت مداح ہیں۔ آج ہی دلی سے آئی ہیں۔ بڑی مشکلوں سے آپ کا نمبر حاصل کیا ہے۔ آپ سے ملاقات کرنے کے لئے تڑپ رہی ہیں۔ ضرور حاضر ہوتیں مگر پردے کی پابندی ہے۔ آپ بہت حسین ہیں۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب، گلا ماشاءاللہ بہت ہی سریلا ہے (حالانکہ ان کو معلوم ہوتا تھا کہ اس میں امیر بائی بولتی ہے یا شمشاد)

عام طور پر مشہور فلم ایکٹرسوں کے ٹیلیفون نمبر ڈائرکٹری میں درج نہیں ہوتے۔ وہ خود نہیں کراتیں کہ ان کے چاہنے والے بیکار تنگ نہ کریں۔ مگر ان تین بہنوں نے میرے دوست آغا خلش کاشمیری کے ذریعے سے قریب قریب ان تمام ایکٹرسوں کے فون نمبر معلوم کر لئے تھے۔ جو انھیں ڈائرکٹری میں نہیں ملے تھے۔

اس ٹیلی فون شغل کے دوران میں جب انھوں نے نرگس کو بلایا اور

اس سے بات چیت کی تو بہت پسند آگئی۔ اس گفتگو میں ان کو اپنی عمر کی آواز سنائی دی۔ چنانچہ چند گفتگوؤں ہی میں وہ اس سے بے تکلف ہو گئیں۔ مگر اپنی اصلیت چھپائے رکھی۔ ایک کہتی ہیں افریقہ کی رہنے والی ہوں۔ وہی دوسری بار یہ بتاتی کہ لکھنؤ سے اپنی خالہ کے پاس آئی ہے۔ دوسری یہ ظاہر کرتی کہ وہ راولپنڈی کی رہنے والی ہے اور صرف اس لئے بمبئی آئی ہے۔ کہ اسے نرگس کو ایک بار دیکھنا ہے تیسری، یعنی میری بیوی کبھی گجراتن بن جاتی کبھی پارسن۔

ٹیلیفون پر کئی بار نرگس نے جھنجھلا کر پوچھا کہ تم لوگ اصل میں کون ہو۔ کیوں اپنا نام پتہ چھپاتی ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں بتاتیں کہ یہ روز روز کی ٹن ٹن ختم ہو۔

ظاہر ہے کہ نرگس ان سے متاثر تھی۔ اس کو یقیناً اپنے سیکڑوں مداحوں کے فون آتے ہوں گے۔ مگر یہ تین لڑکیاں ان سے کچھ مختلف تھیں۔ اس لئے وہ سخت بے چین تھی۔ کہ ان کی اصلیت جانے اور ان سے ملے جلے، چنانچہ جب بھی اسے معلوم ہوتا۔ کہ ان پر اسرار لڑکیوں نے اسے بلایا ہے تو وہ سو کام چھوڑ کر آتی۔ اور بہت دیر تک ٹیلیفون کے ساتھ چپکی رہتی۔

ایک دن نرگس کے پیہم اصرار پر بالآخر طے ہو گیا۔ کہ ان کی ملاقات ہو کے رہے گی۔ میری بیوی نے اپنے گھر کا پتہ اچھی طرح سمجھا دیا۔ اور کہا کہ اگر پھر بھی مکان ملنے میں دقت ہو تو بائی کھلہ کے پل کے پاس کسی ہوٹل سے ٹیلیفون کر دیا جائے وہ سب وہاں پہنچ جائیں گی۔

جب میں گھر میں داخل ہوا۔ بائی کھلہ کے پل کے ایک اسٹور سے نرگس

نے فون کیا تھا کہ وہ پہنچ چکی ہے مگر مکان نہیں مل رہا ہے۔ چنانچہ تینوں افراتفری کے عالم میں تیار ہو رہی تھیں کہ میں بلائے ناگہانی کی طرح پہنچ گیا۔

چھوٹی کا خیال تھا کہ میں ناراض ہوں گا۔ بڑی یعنی میری بیوی محض بوکھلائی ہوئی تھی۔ کہ یہ سب کیا ہوا ہے — میں نے ناراض ہونے کی کوشش کی مگر مجھے اس کے لئے کوئی معقول جواز نہ ملا۔ سارا قصہ کافی دلچسپ اور بے حد معصوم تھا۔ اگر "کان مچولی" کی حرکت صرف میری بیوی سے سرزد ہوئی ہوتی۔ تو بالکل جدا بات تھی۔ ایک سالی آدھے گھر والی ہوتی ہے اور یہاں دو سالیاں تھیں۔ پورا گھر ہی ان کا تھا۔ میں جب اٹھا تو دوسرے کمرے میں خوش ہونے اور تالیاں بجانے کی آوازیں بلند ہوئیں۔

بائی کھلہ کے چوک میں جدن بائی کی لمبی چوڑی موٹر کھڑی تھی۔ میں نے سلام کیا تو اس نے حسب معمول بڑی بلند آواز میں اس کا جواب دیا اور پوچھا۔ "کہو منٹو کیسے ہو۔"

میں نے کہا۔ "اللہ کا شکر ہے۔ کہئے آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔"

جدن بائی نے پچھلی نشست پر بیٹھی ہوئی نرگس کی طرف دیکھا۔ "کچھ نہیں۔ بے بی کو اپنی سہیلیوں سے ملنا تھا۔ مگر ان کا مکان نہیں مل رہا۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "چلئے میں آپ کو لے چلوں"۔

نرگس یہ سن کر کھڑکی کے پاس آ گئی "آپ کو ان کا مکان معلوم ہے؟"

میں نے اور زیادہ مسکرا کر کہا۔ "کیوں نہیں — اپنا مکان کون بھول سکتا ہے۔"

جدن بائی کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی پان کے بیڑے کو دوسرے کلّے میں تبدیل کرتے ہوئے کہا "یہ تم کیا افسانہ نگاری کر رہے ہو۔"

میں دروازہ کھول کر جدن بائی کے پاس بیٹھ گیا۔ بی۔ بی! یہ افسانہ نگاری میری نہیں ہے۔ میری بیوی اور اس کی بہنوں کی ہے"۔ اس کے بعد میں نے مختصراً تمام واقعات بیان کر دیئے۔ نرگس بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔ جدن بائی کو بہت کوفت ہوئی"۔ لاحول ولا۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ کیسی لڑکیاں ہیں پہلے دن کہہ دیا ہوتا۔ کہ ہم منٹو کے گھر سے بول رہی ہیں۔ خدا کی قسم میں فوراً بے بی کو بھیج دیتی بھئی حد ہو گئی ہے۔ اتنے دن پریشان کیا۔۔۔۔۔ خدا کی قسم بے چاری بے بی کو اتنی الجھن ہوتی تھی کہ میں تم سے کیا کہوں۔ جب ٹیلی فون آتا۔ بھاگی بھاگی جاتی۔ میں ہزار پوچھتی۔ یہ کون ہے۔ جس سے اتنی دیر میٹھی میٹھی باتیں ہوتی ہیں۔ مجھ سے کہتی کوئی ہیں جانتی نہیں کون ہیں۔ مگر ہیں بڑی اچھی۔ دو ایک بار میں نے بھی ٹیلیفون اٹھایا۔ گفتگو ماشاء اللہ بڑی شائستہ تھی۔ کسی اچھے گھر کی معلوم ہوتی تھیں۔ مگر معاف کرنا۔ کم بخت اپنا نام پتہ صاف بتاتی ہی نہیں تھیں۔ آج بے بی آئی۔ خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی کہنے لگی۔ بی بی۔ انہوں نے بلایا ہے۔ اپنا ایڈریس دیدیا ہے۔ میں نے کہا پاگل ہوئی ہو۔ منٹو جانے کون ہیں۔ کون نہیں ہیں۔ پر اس نے میری ایک نہ مانی بس پیچھے پڑ گئی۔ چنانچہ مجھے ساتھ آنا ہی پڑا ــــ خدا کی قسم اگر معلوم ہوتا کہ یہ آفتیں تمہارے گھر کی ہیں۔۔۔"

میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "تو ساتھ آپ نازل نہ ہوتیں"۔

جدن بائی کے کلّے میں دبے ہوئے پان میں چوڑی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ "اس کی ضرورت ہی کیا تھی میں کیا تمہیں جانتی نہیں۔"

مرحومہ کو اُردو ادب سے بڑا شغف تھا میری تحریریں بڑے شوق سے پڑھتی اور پسند کرتی تھیں ان دنوں میرا ایک مضمون "ساقی" میں شائع ہوا تھا۔ غالباً "ترقی یافتہ قبرستان" معلوم نہیں ان کا ذہن کیوں اس طرف چلا گیا۔ "خدا کی قسم منٹو۔ بہت خوب لکھتے ہو۔ ظالم کیا طنز کیا تھا۔ اس مضمون میں کیوں بے بی۔ اس دن کیا حال ہوا تھا میرا یہ مضمون پڑھ کر۔"

مگر نرگس اپنی نادیدہ سہیلیوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اضطراب بھرے لہجہ میں اس نے اپنی ماں سے کہا۔ "چلو بی۔ بی۔"

جدن بائی مجھ سے مخاطب ہوئی "چلو بھائی۔" گھر پاس ہی تھی موٹر اسٹارٹ ہوئی۔ اور ہم پہنچ گئے۔ اوپر بالکنی سے تینوں بہنوں نے ہمیں دیکھا چھوٹی کا مارے خوشی کے برا حال ہو رہا تھا۔ خدا معلوم آپس میں کیا کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ جب ہم اوپر پہنچے تو عجیب وغریب طریقے پر سب کی ملاقات ہوئی۔ نرگس اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اور میری بیوی اور جدن بائی وہیں بیٹھ گئے۔

بہت دیر مختلف زاویوں سے کان بجلی کے سلسلے پر تبصرہ کیا گیا۔ میری بیوی کی بوکھلاہٹ جب کسی قدر کم ہوئی تو اس نے میزبان کے فرائض سرانجام دینے شروع کر دیئے۔

میں اور جدن بائی فلم انڈسٹری کے حالات پر تبادلۂ خیالات کرتے رہے

پان کھانے کے معاملے میں بڑی خوش ذوق تھیں ہر وقت اپنی پندنیاں ساتھ رکھتی تھیں۔ بڑی دیر کے بعد موقع ملا تھا اس لئے میں نے اس پر خوف ہاتھ صاف کیا۔

نرگس کو میں نے ایک مدت کے بعد دیکھا تھا۔ دس گیارہ برس کی بچی تھی۔ جب میں نے ایک دو مرتبہ فلموں کی نمائش عظمیٰ میں اسے اپنی ماں کی انگلی کے ساتھ بیٹی دیکھا تھا۔ چندھیائی ہوئی آنکھیں بے کشش سالمبوترا چہرہ سوکھی سوکھی ٹانگیں ایسا معلوم ہوتا تھا۔ سو کے اٹھی ہے یا سونے والی ہے۔ مگر اب وہ ایک جوان لڑکی تھی۔ عمر نے اس کی خالی جگہیں پر کردی تھیں مگر آنکھیں ویسی کی ویسی تھیں۔ چھوٹی اور خواب زدہ۔ بیمار بیمار — میں نے سوچا اس رعایت سے اس کا نام نرگس موزوں و مناسب ہے۔

طبیعت میں نہایت ہی معصوم کھلنڈرا پن تھا۔ بار بار اپنی ناک پونچھتی تھی۔ جیسے ازلی زکام کی شکار رہے دبرسات ہیں اس کو ادا کے طور پہ پیش کیا گیا ہے، مگر اس کے اداس چہرے سے صاف عیاں تھا۔ کہ وہ اپنے اندر کردار نگاری کا جوہر رکھتا ہے۔ ہونٹوں کو کسی قدر کھینچ کر بمدست کرنے اور مسکرانے میں بظاہر ایک بناوٹ تھی۔ مگر کردار نگاری کی بنیادیں بناوٹ ہی پہ تو استوار ہوتی ہیں۔

ایک بات جو خاص طور پر میں نے محسوس کی وہ یہ ہے کہ نرگس کو اس بات کا کامل احساس تھا کہ وہ ایک دن بہت بڑی اسٹار بننے والی ہے۔ مگر یہ دن قریب تر لانے اور اسے دیکھ کر خوش ہونے میں اسے کوئی عجلت

نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اپنے لڑکپن کی ننھی منی خوشیاں گھسیٹ کر وہ انہیں بڑی بڑی بے ہنگم خوشیوں کے دائرے میں نہیں لے جانا چاہتی تھی۔

تینوں ہم عمر لڑکیاں دوسرے کمرے میں جو باتیں کر رہی تھیں۔ ان کا دائرہ گھر اور کنونٹ کی چار دیواری تک محدود تھا۔ فلم اسٹوڈیو میں کیا ہوتا ہے۔ رومانس کیا بلا ہے۔ اس سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نرگس بھول گئی تھی کہ وہ فلم اسٹار ہے پردے پر جس کی ادائیں بکتی ہیں۔ اور اس کی سہیلیاں بھی یہ بھول گئیں تھیں۔ کہ نرگس اسکرین پر بڑی بڑی حرکتیں کرنے والی ایکٹرس ہے۔

میری بیوی جو عمر میں نرگس سے بڑی تھی اب اس کی آمد پر بالکل بدل گئی تھی۔ اس کا سلوک اس سے ایسا ہی تھا۔ جیسا اپنی چھوٹی بہنوں سے تھا۔ پہلے اس کو نرگس سے اس لئے دلچسپی تھی۔ کہ وہ فلم ایکٹرس ہے۔ پردے پر بڑی خوبی سے نت نئے مردوں سے محبت کرتی ہے۔ ہنستی ہے آہیں بھرتی ہے۔ کد کڑے لگاتی ہے۔ اب اسے خیال تھا کہ وہ کھٹی چیزیں نہ کھائے بہت ٹھنڈا پانی نہ پیے زیادہ فلموں میں کام نہ کرے اپنی صحت کا خیال رکھے اب اس کے نزدیک نرگس کا فلموں میں کام کرنا کوئی معیوب بات نہیں تھی۔

میں، میری بیوی، اور جدن بائی اِدھر اُدھر کی باتوں میں مشغول تھے کہ آپا سعادت آگئیں۔ میری ہم نام ہیں اور بڑی ہی دلچسپ چیز ہیں۔ تصنع سے لاکھوں میل دور ہیں۔ حسب معمول وہ اس انداز سے آئیں کہ جدن بائی سے ان کو متعارف کرانے کا ہمیں موقع ہی نہ ملا۔ اپنے دو ڈھائی من کے وجود کے بوجھ کو صوفے پر ہلکا کرتے ہوئے بولیں "صفو جان تمہارے بھائی جان سے میں نے لاکھ کہا تھا کہ

ایسی مردار موٹر نہ خرید دیگر انہوں نے ایک نہ سُنی ۔ دو قدم چلی ہوگی کہ ہانپنے لگی اور کھڑی ہو گئی ۔ اب کھڑے ہینڈل مار رہے ہیں ۔ میں نے کہا ۔ آپ جلیئے میں تو صفو کے پاس بیٹھتی ہوں ۔

جدن بائی غالباً کسی نواب کی بات کر رہی تھیں جو بہت عیاش تھا ۔ آپا سعادت کی وجہ سے چونکہ یہ بات مکمل نہ ہو سکی تھی ۔ جب پھر شروع ہوئی تو آپا سعادت نے بھی اس میں حصہ لینا شروع کر دیا ۔ کاٹھیاواڑ کی قریب قریب تمام ریاستوں اور ان کے نوابوں کو وہ اچھی طرح جانتی تھیں ۔ کیونکہ ریاست مانگرول کے نوابی خاندان میں بیاہی گئی تھیں ۔

جدن بائی اپنے پیشے کی وجہ سے تمام والیانِ ریاست کو اچھی طرح جانتی پہچانتی تھیں ۔ باتوں باتوں میں ایک بڑی ریاست خور قسم کی طوائف کا ذکر چھڑ گیا آپا سعادت شروع ہو گئیں ۔ خدا ان سے محفوظ رکھے جس کے ساتھ چمٹتی ہیں ۔ اس کو دین کا رکھتی ہیں نہ دنیا کا ۔ دولت برباد ، صحت برباد ، عزت برباد ، صفو جان میں تمہیں کیا بتاؤں ، سو بیماریوں کی ایک بیماری ہے یہ طوائف ۔

میں اور میری بیوی سخت پریشان کہ آپا سعادت کو کیسے روکیں جدن بائی بڑی فراخ دلی سے آپا سعادت کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں اور ہم دونوں پسینہ ہوئے جا رہے تھے ۔ ایک دو بار میں نے ان کو روکنے کی کوشش کی مگر وہ اور زیادہ جوش میں آ گئیں ۔ جی بھر کے گالیاں دینے لگیں ۔ لیکن یک لخت انہوں نے جدن بائی کی طرف دیکھا ۔ ان کے سفید گوشت بھرے چہرے پر ایک عجیب و غریب تھرتھری پیدا ہوئی ۔ ان کی ناک کی کیل کا ہیرا گردن کی جنبش کے ساتھ دو تین دفعہ

بڑی تیزی سے جھکا پھر ان کا منہ کھلا۔ زور سے اپنی رانوں پہ دو ہتڑ مار کر انہوں نے تتلاتے ہوئے لہجے میں جدن بائی سے کہا۔ آپ .... آپ تو جدن .... آپ جدن بائی ہیں نا؟"

جدن بائی نے بڑی متانت سے جواب دیا۔

"جی ہاں"

آپا سعادت کا منہ اور زیادہ کھلا........ "اوہ .... تو آپ .... میرا مطلب ہے کہ آپ تو بہت اونچی طوائف ہیں ...... کیوں صفو جان؟ صفو جان برف ہو گئی۔ میں نے جدن بائی کی طرف دیکھا اور مسکرایا...... میرا خیال ہے بہت ہی واہیات قسم کی مسکراہٹ تھی۔ جدن بائی نے یوں ظاہر کیا۔ جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی اور اس بڑی ریاست خور قسم کی طوائف کے بقایا حالات بیان کرنے شروع کر دیئے جس کا ذکر چھیڑنے پر آپا سعادت کو لکچر دینا پڑا تھا۔

جدن بائی کی کوشش کے باوجود بات نہ بنی آپا سعادت کو اپنی غلطی کا اور ہمیں اپنی خفت کا بہت ہی شدید احساس تھا۔ مگر جب لڑکیاں آگئیں تو فضا کا تکدر دور ہو گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد نرگس سے فرمائش کی گئی کہ وہ گانا سنائے اس پر جدن بائی نے کہا "میں نے اس کو موسیقی کی تعلیم نہیں دی۔ موہن بابو اس کے خلاف تھے۔ اور سچ پوچھئے تو مجھے بھی پسند نہیں تھا۔ تھوڑا بہت ٹوں ٹوں کر لیتی ہے" اس کے بعد وہ اپنی بیٹی سے مخاطب ہوئیں۔ "سُنا دو بے بی ..... جیسا بھی آتا ہے سُنا دو"

نرگس نے بڑی ہی معصومانہ بے تکلفی سے گانا شروع کر دیا — پہلے

درجے کی گن سُری تھی۔ آواز میں رس نہ لوچ، میری چھوٹی سالی اس سے لاکھوں درجے بہتر گاتی تھی۔ مگر فرمائش کی گئی تھی اور وہ بھی بڑی پُر اصرار اس لئے دو تین منٹ تک اس کا گانا برداشت کرنا ہی پڑا۔ جب اس نے ختم کیا تو سب نے تعریف کی۔ میں اور آپا سعادت خاموش رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد جدن بائی نے رخصت چاہی لڑکیاں نرگس سے گلے ملیں۔ دوبارہ ملنے کے وعدے وعید ہوئے۔ کچھ کھسر پھسر بھی ہوئی اور ہمارے مہمان چلے گئے۔

نرگس سے یہ میری پہلی ملاقات تھی .... اس کے بعد اور کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ لڑکیاں ٹیلیفون کرتی تھیں اور نرگس اکیلی موٹر میں چلی آتی تھی۔ اس آمد و رفت میں اس کے ایکٹرس ہونے کا احساس قریب قریب مٹ گیا۔ وہ لڑکیوں سے اور لڑکیاں اس سے یوں ملتی تھیں۔ جیسے وہ ان کی بہت پرانی سہیلی ہے یا کوئی رشتہ دار ہے لیکن جب وہ چلی جاتی تو کبھی کبھی تینوں بہنیں اس استعجاب کا اظہار کرتیں۔ "خدا کی قسم عجیب بات ہے کہ نرگس بالکل ایکٹرس معلوم نہیں ہوتی۔"

اس دوران میں تینوں بہنوں نے اس کا ایک تازہ فلم دیکھا جس میں ظاہر ہے۔ کہ وہ اپنے ہیرو کی محبوبہ تھی جس سے وہ پیار محبت کی باتیں کرتی تھی اور اسے عجیب عجیب نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ اس کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوتی تھی۔ اس کا ہاتھ دباتی تھی۔ میری بیوی کہتی۔ "کمبخت" اس کے فراق میں کیسی لمبی لمبی آہیں بھر رہی تھی۔ جیسے سچ مچ اس کے عشق میں گرفتار ہے۔" اور اس کی چھوٹی

بہنیں اپنے کنوارے اور ایکٹنگ سے ناآشنا، دلوں میں سوچتیں "اور کل وہ ہم سے پوچھ رہی تھی کہ گڑ کی ٹوفی کیسے بنائی جاتی ہے"۔

نرگس کی اداکاری کے متعلق میرا خیال بالکل مختلف تھا۔ وہ قطعی طور پر جذبات واحساسات کی صحیح عکاسی نہیں کرتی تھی۔ محبت کی نبض کس طرح چلتی ہے۔ یہ اناڑی انگلیاں کیسے محسوس کرسکتی تھیں۔ عشق کی دوڑ میں تھک کر ہانپنا اور اسکول کی دوڑ میں تھک کر سانس کا پھول جانا۔ بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ خود نرگس بھی اس کے فرق سے آگاہ نہیں تھی۔ چنانچہ اس کے شروع کے فلموں میں دقیقہ رس نگاہیں فوراً معلوم کرسکتی ہیں کہ اس کی اداکاری یکسر فریب کاری سے معرا تھی۔

تصنع کا یہ کمال ہے کہ وہ تصنع معلوم نہ ہو۔ لیکن نرگس کے تصنع کی بنیادیں چونکہ تجربے پر استوار نہیں تھیں اس لئے اس میں یہ خوبی نہیں تھی یہ صرف اس کا خلوص تھا وہ بے پناہ خلوص جو اسے اپنے شوق سے تھا۔ کہ وہ جذبات، احساسات کے نہایت ہی خام اظہار کے باوجود اپنا کام نبھا جاتی تھی۔ عمر اور تجربے کے ساتھ ساتھ اب وہ بہت پختگی اختیار کرچکی ہے۔ اب اس کو عشق کی دوڑ اور اسکول کی ایک میل کی دوڑ میں تھک کر ہانپنے کا فرق معلوم ہے۔ اب تو اس کو سانس کے ہلکے سے ہلکے زیر وبم کا نفسیاتی پس منظر بھی معلوم ہے۔

یہ بہت اچھا ہوا کہ اس نے اداکاری کی منازل آہستہ آہستہ طے کیں۔ اگر وہ ایک جست میں آخری منزل پر پہنچ جاتی تو اہلِ ذوق فلم بینوں کے

صناعانہ جذبات کو بہت ہی گنوار قسم کا صدمہ پہنچتا اور اگر لڑکپن کے زمانے میں پردے سے الگ زندگی میں بھی وہ ایکٹرس بنی رہتی اور اپنی عمر کو عیار بزازوں کے گز سے ماپ کر دکھاتی۔ تو میں اس صدمے کی تاب نہ لا کر یقیناً مر گیا ہوتا۔

نرگس ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔ کہ اس کو لامحالہ ایکٹرس بننا ہی تھا۔ جدن بائی کے گلے میں بڑھاپے کا گھنگرو بول رہا تھا۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ مگر اُن کی ساری توجہ بے بی نرگس پر مرکوز تھی۔ اس کی شکل وصورت معمولی تھی۔ گلے میں سُر کی پیدائش کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ مگر جدن بائی جانتی تھیں کہ سُر مستعار لیا جاسکتا ہے۔ اور معمولی شکل وصورت میں اندرونی روشنی سے جسے جوہر کہتے ہیں۔ دلکشی پیدا کی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جان مار کر اس کی پرورش کی۔ اور کانچ کے نہایت ہی نازک اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جوڑ جوڑ کر اپنا درخشاں وتاباں خواب پورا کیا۔

جدن بائی تھی۔ اس کی ماں تھی۔ اس کا موہن بابو تھا۔ بے بی نرگس تھی اس کے دو بھائی تھے۔ اتنا بڑا کنبہ تھا۔ جس کا بوجھ صرف جدن بائی کے کندھوں پر تھا۔ موہن بابو ایک بہت بڑے رئیس زادہ تھے۔ جدن بائی کے گلے کی تانوں اور مرکیوں میں ایسے اُلجھے کہ دین دنیا کا ہوش نہ رہا۔ خوبصورت تھے۔ صاحب ثروت تھے تعلیم یافتہ تھے صحت مند تھے۔ مگر یہ باتیں جدن بائی کے در پہ مفلس اور گداگر بن گئیں۔ جدن بائی کے نام کا اس زمانے میں ڈنکا بجتا تھا۔ بڑے بڑے نواب اور راجے اس کے مجروں پر سونے اور چاندی کی بارش برساتے تھے۔ مگر جب یہ بارشیں تھم جاتیں تو اور آسمان

نکھر جاتا اور جدن بائی اپنے موہن کو اٹھا کر سینے سے لگا لیتی۔ کہ اسی موہن کے پاس اس کا من تھا۔

موہن بابو تا دم آخر جدن بائی کے ساتھ تھے وہ ان کی بہت عزت کرتی تھی۔ اس لئے کہ وہ راجوں اور نوابوں کی دولت میں غریبوں کے خون کی بو سونگھ چکی تھیں۔ اُن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کے عشق کا دھارا ایک ہی سمت نہیں بہتا۔ وہ موہن بابو سے محبت کرتی تھیں۔ کہ وہ اُن کے بچوں کا باپ تھا۔

خیالات کی رو میں جانے کدھر بہہ گیا۔ نرگس کو بہر حال ایکٹرس بننا تھا چنانچہ وہ بن گئی۔ اس کے بام عروج تک پہنچنے کا راز جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کا خلوص ہے۔ جو قدم بہ قدم، منزل بہ منزل اس کے ساتھ رہا ہے۔

ایک بات جو ان ملاقاتوں میں خاص طور پر میں نے محسوس کی وہ یہ ہے کہ نرگس کو اس بات کا احساس تھا۔ کہ جن لڑکیوں سے وہ ملتی ہے وہ جدید قسم کے آب و گل سے بنی ہیں۔ وہ ان کے پاس آتی تھی۔ گھنٹوں ان سے معصوم معصوم باتیں کرتی تھی۔ مگر وہ ان کو اپنے گھر مدعو کرنے میں ایک عجیب قسم کی جھجک محسوس کرتی تھی۔ اس کو شاید یہ ڈر تھا کہ وہ اس کی دعوت ٹھکرا دیں گی۔ یہ کہیں گی کہ وہ اس کے یہاں کیسے جا سکتی ہیں۔ میں ایک دن گھر میں موجود تھا۔ کہ اس نے سرسری طور پر اپنی سہیلیوں سے کہا۔ ”اب کبھی تم بھی ہمارے گھر آؤ۔“

یہ سُن کر تینوں بہنوں نے بڑے ہی بھنڈے پن سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ شاید یہ سوچ رہی تھیں۔ کہ ہم نرگس کی یہ دعوت کیسے قبول کر سکتی ہیں۔ لیکن میری بیوی چونکہ میرے خیالات سے واقف تھی۔ اس لئے

ایک روز نرگس کے پیہم اصرار پر اُس کی دعوت قبول کر لی گئی۔ اور مجھے بتائے بغیر وہ تینوں اُس کے گھر چلی گئیں۔

نرگس نے اپنی کار بھیج دی تھی۔ جب وہ بمبئی کے خوبصورت ترین مقام میرین ڈرائیو کے اس فلیٹ میں پہنچیں جہاں نرگس رہتی تھی۔ تو انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی آمد پر خاص انتظامات کئے گئے تھے۔ موہن بابو اور اُن کے دونوں جوان لڑکوں کو منع کر دیا گیا تھا۔ کہ وہ گھر میں داخل نہ ہوں۔ کیونکہ نرگس کی سہیلیاں آ رہی ہیں۔ مرد نوکروں کو بھی اس کمرے میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ جہاں ان معزز مہمانوں کو بٹھایا گیا تھا۔ خود جدن بائی تھوڑی دیر کے لئے رسمی طور پر ان کے پاس بیٹھیں اور اندر چلی گئیں۔ وہ ان کی معصوم گفتگوؤں میں حارج نہیں ہونا چاہتی تھیں۔

تینوں بہنوں کا بیان ہے کہ نرگس ان کی آمد پر پھولی نہیں سماتی تھی۔ وہ اس قدر خوش تھی۔ کہ بار بار گھبرا سی جاتی تھی۔ اپنی سہیلیوں کی خاطر داری میں اس نے بڑے ہوش کا اظہار کیا۔ پاس ہی پرشین ڈیری تھی۔ اس کے "ملک شیک" مشہور تھے۔

گاڑی میں جا کر نرگس خود ہی مشروب جگ میں تیار کرا کے لائی۔ کیونکہ وہ یہ کام نوکر کے سپرد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے کہ پھر اس کے اندر آنے کا احتمال تھا۔ خاطر داری کے اس جوش خروش میں نرگس نے اپنے نئے سیٹ کا گلاس توڑ دیا۔ مہمانوں نے افسوس کا اظہار کیا۔ تو نرگس نے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ بی بی غصے ہوں گی مگر ڈیڈی اُن کو چپ کرا دیں گے۔" اور

معاملہ رفع دفع ہو جائے گا۔"

موہن بابو کو اس سے اور اس کو موہن بابو سے بہت محبت تھی۔

"ملک شیک" پلانے کے بعد نرگس نے مہمانوں کو اپنا البم دکھایا جس میں اس کے مختلف فلموں کے اسٹل تھے۔ اس نرگس میں جوان کو یہ فوٹو دکھا رہی تھی اور اس نرگس میں جوان تصویروں میں موجود تھی۔ کتنا فرق تھا۔ تینوں بہنیں کبھی اس کی طرف دیکھتیں۔ اور کبھی البم کے اوراق کی طرف اور اپنی حیرت کا یوں اظہار کرتیں "نرگس" تم یہ نرگس کیسے بن جاتی ہو۔

نرگس جواب میں صرف مسکرا دیتی۔

میری بیوی نے مجھے بتایا۔ کہ گھر میں نرگس کی ہر حرکت، ہر ادا میں الھڑپن تھا۔ اس میں وہ شوخی، وہ طراری، وہ تیکھا پن نہیں تھا، جو اس کے سراپا میں پردے پر نظر آتا ہے۔ وہ بڑی ہی گھریلو قسم کی لڑکی تھی۔ میں نے خود بھی محسوس کیا تھا۔ لیکن جانے کیوں اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں مجھے ایک عجیب و غریب قسم کی اداسی تیرتی نظر آتی تھی۔ جیسے کوئی لاوارث لاش تالاب کے ٹھہرے پانی پر ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے ارتعاش پذیر ہے۔

یہ قطعی طور پر طے تھا کہ شہرت کی جس منزل پر نرگس کو پہنچنا تھا وہ کچھ زیادہ دور نہیں تھی۔ تقدیر اپنا فیصلہ اس کے حق میں کر کے تمام متعلقہ کاغذات اس کے حوالے کر چکی تھی۔ لیکن پھر وہ کیوں مغموم تھی۔ کیا غیر شعوری طور پر وہ یہ محسوس تو نہیں کر رہی تھی۔ کہ عشق و محبت کا یہ مصنوعی کھیل کھیلتے کھیلتے ایک دن وہ کسی ایسے لق و دق صحرا میں نکل جائے گی۔ جہاں سراب ہی سراب ہوں گے

پیاس سے اس کا حلق سوکھ رہا ہوگا۔ اور آسمان پر چھوٹی چھوٹی بدلیوں کے تھنوں میں صرف اس لئے دودھ نہیں اترے گا کہ وہ یہ خیال کریں گی کہ نرگس کی پیاس محض بناوٹ ہے۔ زمین کی کوکھ میں پانی کی بوندیں اور زیادہ اندر کو سمٹ جائیں گی۔ اس خیال سے کہ اس کی پیاس صرف ایک دکھاوا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود نرگس بھی یہ محسوس کرنے لگے کہ میری پیاس کہیں جھوٹی پیاس تو نہیں ——

اتنے برس گذر جانے پر میں اب اسے پردے پر دیکھتا ہوں۔ تو مجھے اس کی اُداسی کچھ مضمحل سی نظر آتی ہے۔ پہلے اس میں ایک مستعد جستجو تھی۔ لیکن اب یہ جستجو بھی اداس اور مضمحل ہے۔ کیوں ——؟ اس کا جواب اب خود نرگس ہی دے سکتی ہے۔

تینوں بہنیں چونکہ چوری چوری نرگس کے ہاں گئی تھیں۔ اس لئے وہ زیادہ دیر تک اس کے پاس نہ بیٹھ سکیں۔ چھوٹی دد کو یہ اندیشہ تھا کہ ایسا نہ ہو مجھے اس کا علم ہو جائے۔ چنانچہ انھوں نے نرگس سے رخصت چاہی اور واپس گھر آ گئیں۔

نرگس کے متعلق وہ جب بھی بات کرتیں۔ گھوم پھر کر اس کی شادی کے مسئلے پر آجاتیں۔ چھوٹی دد کو یہ جاننے کی خواہش تھی۔ کہ وہ کب اور کہاں شادی کرے گی۔ بڑی جس کی شادی ہوئے پانچ برس ہو چکے تھے۔ یہ سوچتی تھی کہ شادی کے بعد وہ ماں کیسی بنے گی۔

کچھ دیر تک میری بیوی نے نرگس سے اس خفیہ ملاقات کا حال

چھپائے رکھا۔ آخر ایک روز بتادیا۔ میں نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔ تو اس نے سچ سمجھتے ہوئے مجھ سے معافی مانگی اور کہا "واقعی ہم سے غلطی ہوئی۔ مگر اب آپ اس کا ذکر کسی سے نہ کیجئے گا۔"

وہ چاہتی تھی کہ بات مجھ ہی تک رہے۔ ایک ایکٹرس کے گھر جانا تینوں بہنوں کے نزدیک بہت ہی معیوب بات تھی۔ وہ اس "حرکت" کو چھپانا چاہتی تھیں چنانچہ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس کا ذکر انہوں نے اپنی ماں سے بھی نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ بالکل تنگ خیال نہیں تھیں۔

میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ ان کی وہ حرکت مذموم کیوں کر تھی۔ اگر وہ نرگس کے ہاں گئی تھیں۔ تو اس میں برائی ہی کیا تھی۔ اداکاری معیوب کیوں سمجھی جاتی ہے۔ کیا ہمارے اپنے خاندانوں کے حلقے میں ایسے افراد نہیں ہوتے۔ جن کی ساری عمر فریب کاریوں اور ملمع کاریوں میں گذر جاتی ہے۔ نرگس نے تو اداکاری کو اپنا پیشہ بنایا تھا۔ اس نے اس کو راز بنا کر نہیں رکھا تھا۔ کتنا بڑا فریب ہے جس میں یہ لوگ مبتلا رہتے ہیں۔

اس مضمون کے آغاز میں میں نے ایک خط کا کچھ حصہ نقل کیا ہے۔ جو مجھے تسنیم سلیم نے لکھا تھا۔ اب میں اس کی طرف لوٹتا ہوں۔ دراصل ساری بات ہی اس سے چلی تھی۔

چونکہ مجھے نرگس سے اس کے گھر میں ملنے کا اشتیاق تھا۔ اس لئے میں، مصروف ہونے کے باوجود مسٹر سلیم اور ان کے مصاحبوں کے ساتھ "میرین ڈرائیو" چل پڑا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ میں فون کے ذریعے سے جدن بائی کو اپنی آمد سے مطلع

کردیتا اور یہ بھی معلوم کرلیتا۔ کہ نرگس فارغ بھی ہے یا نہیں۔ لیکن میں عام زندگی میں چونکہ ایسے تکلفات کا قائل نہیں۔ اس لئے بغیر اطلاع دیئے وہاں جا دھمکا۔ جدن بائی باہر برآمدے میں بیٹھی سروتے سے چھالیہ کاٹ رہی تھی، مجھے دیکھا تو بآواز بلند کہا۔ "اوہ منٹو" آؤ۔ بھائی آؤ۔" پھر نرگس کو آواز دی بے بی...... تمہاری سہیلیاں آئی ہیں ــ"

میں نے قریب جاکر اسے بتایا کہ میرے ساتھ سہیلیاں نہیں۔ "سہیلے" ہیں جب میں نے نواب چھتاری کے داماد کا ذکر کیا۔ تو اس کا لہجہ بدل گیا۔

"بلالو انہیں۔" نرگس دوڑی دوڑی آئی۔ تو اس نے کہا "تم اندر جاؤ بے بی منٹو صاحب کے دوست آئے ہیں۔" جدن بائی نے میرے دوستوں کی کچھ اس انداز سے آؤ بھگت کی۔ جیسے وہ مکان دیکھنے اور پسند کرنے آئے تھے۔ وہ بے تکلفی جو میرے لئے مخصوص تھی۔ غائب ہوگئی۔ بیٹھو تشریف رکھئے میں تبدیل ہوگیا۔ کیا پیوگے۔ کیا نوش فرمائیے گا۔ بن گیا۔ تم آپ ہوگیا۔ اور میں خود کو اجنبی محسوس کرنے لگا۔

میں نے اپنی اور اپنے دوست کی آمد کا مدعا بیان کیا۔ تو جدن بائی نے بڑے ہی پُر تصنع انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے میرے ساتھیوں سے کہا۔ "بے بی سے ملنا چاہتے ہیں...... کیا بتاؤں کئی دنوں سے غریب کی طبیعت ناساز ہے۔ دن رات کی شوٹنگ نے اُسے بے حد مضمحل کردیا ہے۔ بہت منع کرتی ہوں کہ دو ایک روز آرام کرلو۔ مگر شوق ایسا ہے کہ نہیں سنتی محبوب نے بھی کہا۔ کہ بیٹا کوئی حرج نہیں تم ریسٹ کرلو۔ میں شوٹنگ بند کردیتا ہوں۔ مگر نہ مانی...... آج کل میں نے زبردستی

روک لیا...... زکام سے نڈھال ہو رہی ہے عزیب"۔

یہ سُن کر میرے دوستوں کو ظاہر ہے۔ بہت مایوسی ہوئی۔ نرگس کی ایک جھلک وہ ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے۔ دیکھ چکے تھے۔ اور اس کو مفصل طور پر دیکھنے لئے بے تاب تھے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت ناساز ہے تو انہیں بڑی کوفت ہوئی۔ جدن بائی اِدھر اُدھر کی باتیں کئے جاتی تھیں۔ جن سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں صاف دیکھ رہا تھا۔ کہ وہ تھوڑی دیر کے بعد جمائیاں لینے لگیں، اور مجھے یہ بھی معلوم تھا۔ کہ نرگس کی ناسازیٔ طبیعت کا بہانہ محض رکھی ہے۔ چنانچہ میں نے جدن بائی سے کہا۔ "بے بی کو زحمت تو ہو گی۔ مگر یہ اتنی دور سے آئے ہیں ذرا بلا لیجیے"۔

اندر تین چار مرتبہ کہلوانے کے بعد نرگس آئی سب نے اٹھ کر تعظیماً اسے سلام کیا۔ میں بیٹھا رہا۔ نرگس کا داخلہ فلمی تھا۔ اس کا بیٹھنا۔ اٹھنا فلمی تھا۔ اس کی گفتگو فلمی تھی۔ جیسے سیٹ پر مکالمے بول رہی ہے۔

اور میرے ساتھیوں کے سوال جواب بڑے ہی نوابانہ قسم کے اوٹ پٹانگ تھے۔

"آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی"۔

"جی ہاں آج ہی بمبئی پہنچے ہیں"۔

"کل پرسوں واپس چلے جائیں گے"۔

"آپ ماشاء اللہ اس وقت ہندوستان کی چوٹی کی اداکارہ ہیں"

"آپ کے ہر فلم کا ہم نے پہلا شو دیکھا ہے"۔

"یہ تصویر جو آپ نے دی ہے۔ میں اسے اپنے البم میں لگاؤں گا۔"

اس دوران میں موہن بابو بھی آگئے۔ مگر وہ خاموش بیٹھے رہے۔ کبھی کبھی اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں گھما کر ہم سب کو دیکھ لیتے اور پھر خدا جانے کس سوچ میں غرق ہو جاتے۔

سب سے زیادہ باتیں جدّن بائی نے کیں۔ ان میں اس نے ملاقاتیوں پر بڑے واضح الفاظ میں ظاہر کر دیا کہ وہ ہندوستان کے ہر راجے اور ہر نواب کو اندر باہر سے اچھی طرح جانتی ہے۔ نرگس نے جتنی باتیں کیں۔ بہت مختصر اور بناوٹ سے بھرپور تھیں۔ اس کی ہر حرکت اور ہر ادا سے یہ صاف مترشح تھا کہ وہ اپنے ملنے والوں کو یہ چیزیں پلیٹ میں ڈال کر بڑے تکلف سے پیش کر رہی ہے۔ تاکہ وہ اس کا شکریہ ادا کریں۔ وہ دلی طور پر ممنون و متشکر تھے۔ مگر اس امتنان و تشکر سے نرگس متشفی نہیں تھی۔ وہ جواب میں غالباً تصنع ہی کی طالب تھی۔

یہ ملاقات کچھ بہت ہی پھیکی رہی میرے لئے بھی اور میرے ساتھیوں کے لئے بھی۔ میری موجودگی میں وہ کھل کر احمقانہ باتیں نہیں کر سکے تھے۔ اور میں ان کی موجودگی کے باعث بہت ہی تکلیف اور گھٹن محسوس کرتا رہا تھا۔ بہر حال نرگس کا دوسرا رنگ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہیں تھا۔

سلیم اپنے دوستوں کے ساتھ دوسرے روز پھر نرگس کے ہاں گئے اس کی اطلاع انہوں نے مجھے نہ دی میرا خیال ہے اس ملاقات کا رنگ کچھ اور ہی ہوگا۔

نخشب کے ساتھ جس جنگ کا ذکر سبنم نے اپنے خط میں کیا ہے وہ

مجھے بالکل یاد نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس وقت وہاں موجود ہوں۔ کیونکہ جدّن بائی کو شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی تھی، اور بمبئی کے اکثر شعراء اپنا کلام سنانے کے لئے وہاں جایا کرتے تھے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نخشب سے ان کی شاعری ہی پر اختلاف رائے کے باعث ہلکی سی چخ ہوگئی ہو۔

نرگس کا ایک اور دلچسپ رنگ میں نے اس وقت دیکھا جب اشوک میرے ساتھ تھا۔ جدن بائی کوئی اپنا ذاتی فلم تیار کرنے کا ارادہ کررہی تھیں۔ اس کی خواہش تھی کہ اشوک اس کا ہیرو ہو۔ اشوک حسب عادت اکیلا جانے سے گھبراتا تھا۔ چنانچہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔

دوران گفتگو میں کئی نکتے تھے۔ کاروباری نکتے دوستانہ نکتے۔ خوشامدی نکتے۔ یہ نکتے بڑے ہی دلچسپ طریقے پر آپس میں گڈمڈ ہوتے رہے۔ جدّن بائی کا انداز کبھی بزرگانہ ہوتا تھا اور کبھی ہم عصرانہ، وہ کبھی پروڈیوسر بن جاتی تھیں اور کبھی نرگس کی ماں۔ ایسی ماں جو اپنی بیٹی کی قدر و قیمت بڑھانا چاہتی ہے۔ موہن بابو سے کبھی کبھی ہاں میں ہاں ملائی جاتی تھی۔

لاکھوں روپے کا ذکر آیا۔ وہ جو خرچ ہوچکے تھے خرچ ہونے والے تھے اور جو خرچ کئے جاسکتے تھے۔ سب کا حساب انگلیوں پر گنوایا گیا۔ نرگس کا یہ انداز تھا کہ دیکھو اشوک۔ مانتی ہوں کہ تم منجھے ہوئے ایکٹر ہو۔ تمہاری دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ مگر میں بھی کسی طرح کم نہیں۔ تم مان جاؤ گے کہ میں اداکاری کے میدان میں تمہارا مقابلہ کرسکتی ہوں۔ چنانچہ اس کی تمام کوششیں اس نقطے پر مرکوز تھیں اس کے علاوہ کبھی کبھی اس کے اندر عورت بھی بیدار ہوجاتی تھی۔ اس وقت وہ

اشوک سے یہ کہتی معلوم ہوتی۔ "تم پر ہزاروں لڑکیاں فریفتہ ہیں لیکن میں اسے کیا سمجھتی ہوں میرے بھی ہزاروں چاہنے والے موجود ہیں۔ یقین نہ آئے تو کسی مرد سے پوچھ لو۔" اور ساتھ ہی ساتھ ہمیں چیلنج کی ہلکی سی جھلک بھی ہوتی۔ "ہو سکتا ہے تم ہی مجھ پر مرنا شروع کر دو۔"

اور جدن بائی کبھی مصالحت کی طرف جھک جاتیں کہ نہیں، اشوک تم اور بے بی دونوں پر دنیا مرتی ہے۔ اسی لئے تو میں چاہتی ہوں کہ تمہیں ایک ساتھ پیش کروں تاکہ ایک قتل عام ہو اور ہم سب خوب فائدہ اٹھائیں کبھی کبھی وہ ایک اور انداز اختیار کر لیتیں اور مجھ سے مخاطب ہوتیں۔

"منٹو، اشوک اتنا بڑا ایکٹر بن گیا ہے۔ لیکن خدا کی قسم بہت ہی نیک آدمی ہے۔ بڑا کم گو۔ بڑا ہی شرمیلا۔ خدا عمر دراز کرے۔ میں جو فلم شروع کر رہی ہوں۔ اس میں اشوک کے لئے خاص طور پر میں نے کیریکٹر لکھوایا ہے تم سنو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔

میں یہ کیریکٹر سنے بغیر ہی خوش تھا۔ اس لئے کہ جدن بائی کا کیریکٹر خود بہت ہی دلچسپ تھا۔ اور نرگس جو رول ادا کر رہی تھی وہ تو اور بھی زیادہ دلچسپ تھا۔ میرا خیال ہے اگر پردے پر وہ حالات پیش کئے جاتے اور اس سے کہا جاتا کہ اشوک سے مل کر تمہیں ایسی گفتگو کرنا ہے تو وہ کبھی اتنی کامیاب نہ ہوتی جتنی کہ وہ اس وقت تھی۔

باتوں باتوں میں ثریا کا ذکر آیا تو جدن بائی نے ناک بھوں چڑھا کر اس میں اور اس کے سارے خاندان میں کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے۔ ثریا کی

عیب جوئی وہ ایک فرض کے طور پر کرتیں۔ اس کا گلا خراب ہے۔ بے سُری ہے بے استادی ہے۔ دانت بڑے واہیات ہیں۔ اُدھر ثریا کے ہاں جاؤ تو نرگس اور جدن بائی پر عمل جراحی شروع ہو جاتا تھا۔ ثریا کی نانی جو حقیقت میں اس کی ماں تھی حقے کے بلّے اڑا اڑا کر دونوں کو خوب کوستی تھی۔ نرگس کا ذکر آتا تو وہ بُرا سا منہ بنا کر میراثنوں کے انداز میں جگت کرتی "منہ دیکھو جیسے گلا سڑا پپیتا ہوتا ہے"۔

موہن بابو کی خوبصورت اور بڑی بڑی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو چکی ہیں۔ جدن بائی اپنے دل کی بقایا حسرتیں اور تمنائیں لئے منوں مٹی کے نیچے دفن ہیں۔ اس کی بے بی نرگس تصنع اور بناوٹ کے آخری زینے پر پہنچ کر معلوم نہیں اوپر دیکھ رہی ہے یا اس کی اداس اداس آنکھیں نیچے سب سے پہلے زینے کو دیکھ رہی ہیں جب سے اس نے گھٹنیوں چلنا سیکھا تھا۔ وہ خیرہ کن روشنی میں تاریک ترین سائے میں روشنی کی ننھی سی کرن ٹٹول رہی ہے؟ —— روشنی اور سائے کا تانا بانا ہی زندگی ہے۔ اور اس تانے بانے کی عکاسی فلمی زندگی ہے۔ جس میں کبھی ایسا پیچ ایسا خم بھی آجاتا ہے۔ جب روشنی، روشنی رہتی ہے نہ سایہ سایہ!

میری ایکٹرس بھابی

عصمت چغتائی

میری ایکٹرس بھابھی

یہ میری سب سے بڑی بھابھی ہیں، میرے سب سے بڑے بھائی کی سب سے بڑی بیوی ہے۔ اس سے میرا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ خدانہ کرے ان کی بہت سی بیویاں ہیں۔ ویسے اگر آپ ابھر کر سوال کریں تو میرے بھائی کی کوئی بیوی نہیں وہ اب تک کنوارا ہے۔ اس کی روح کنواری ہے۔ ویسے وہ دنیا کی نظر میں بڑی بھابھی کا خدائے مجازی؟ اور پون درجن بچوں کا باپ ہے۔ اس کی شادی ہوئی۔ دولہا بنا، گھوڑے پر چڑھا۔ دولہن کو گھر لاکر پلنگ پر بٹھایا اور پھر پاس ہی خود بیٹھ گیا۔ اور جب سے برابر بیٹھو رہا ہے۔ لیکن تصوف کی باتیں سمجھنے والے ہی جانتے ہیں کہ وہ کنوارا ہے، وہ صدا کنوارا رہے گا۔ اس کا دل نہ بیاہ سکا۔ اور نہ بیاہ سکے گا۔ وہ نہ کبھی دولہا بنا اور نہ گھوڑے پر چڑھا، نہ دولہن کو لایا، اور نہ اس کے سنگ اٹھا بیٹھا۔ وہ تو اس کا باپ تھا جس نے اس کا بیاہ طے کیا، ایرے غیرے نتھو خیرے کی رائے سے۔ وہ بغاوت کے

بخار میں جھلستا رہا۔ مگر چوں نہ کر سکا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے باپ، اس کے ہاتھ بڑے تگڑے ہیں۔ اور جوتے اس سے بھی تگڑے۔ اس لئے اس نے بہتر یہی سمجھا کہ وہ شہید تو ہو ہی رہا ہے۔ جوتے سے شہید نہ ہو تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا، لہٰذا وہ دولہا بنا اور سہرے کے پیچھے تاڑنے والوں نے تاڑ لیا کہ ایک اور سہرا بندھا ہے۔ جو اس کے ارمانوں کے خون میں ڈوبے ہوئے آنسوؤں سے گوندھا گیا ہے۔ جس میں اس کی نہ سنائی دینے والی سسکیاں پوری ہو رہی ہیں جس میں اس کے مسلے ہوئے جذبات اور کچلی ہوئی مسرتیں بندھی ہوئی ہیں — وہ گھوڑے پر نہیں چڑھا۔ اس کی میت ماں باپ کی ہٹ دھرمی کے گھوڑے پر لٹکا دی گئی۔ وہ اپنی دولہن نہیں لاتا، بلکہ ماں باپ کی دولہن تھی۔ انہی کی بیاہتا تھی۔ مگر ایک مجبور بیٹے کی طرح بنا آہ و زاری کے وہ دولہن کے پاس بھی گیا۔ اس کا گھونگھٹ بھی ہٹایا مگر وہ یہی ارادہ کر چکا تھا کہ وہ خود دولہا نہیں بلکہ اس کا باپ ہے جو اس دولہن کا دولہا ہے۔ مگر چونکہ اس وقت میری بھابھی بڑی نہ تھی میرا مطلب ہے وہ جسمانی طور پر دبلی پتلی اور نازک سی چھوکری تھی اس لئے ایک لمحہ کو میری بھابی کا جسم بیاہ گیا، لیکن بہت جلد ہی وہ دبلی پتلی عورت بڑھنا شروع ہوئی اور وہ چند ہی سال میں پھول پھال کر بے تکے گوشت کا ڈھیر بن گئی۔ میرے بھائی نے اس کے اوپر چڑھے ہوئے گوشت کو نہ روکا۔ اس کی توجہ تی روکتی، وہ اس کی تھی کون؟

لیکن وہ بچے...... اس کے ماں باپ کے بچے جنہیں وہ کبھی بھولے

بھی نہ چھوتا۔ تعداد میں بڑھتے رہے، نائیکیں سٹرسٹراتے، میلی ٹانگیں اچھالتے، واویلا مچاتے، مگر میرے بھائی کے دل کے دروازے ویسے ہی بند رہے۔ وہ ویسا ہی کنوارا اور بانجھ رہا۔ میری بھابھی کچھ ایسی ان مرحلوں میں پھنس گئی اس نے پلٹ کر بھی بھیا کی طرف نہ دیکھا۔ کہتی ــــ میں تو پہلے ساس سسر کی بہو ہوں نند کی بھوجائی ہوں، بچوں کی اماں ہوں، نوکروں کی مالک ہوں، محلے ٹولے کی بہو بیٹی ہوں، اور پھر اگر وقت ملا تو تمہاری بیوی بھی بن جاؤں گی۔

بھیا کو اس طرح کی ساجھے کی ہانڈی بڑی پھیکی سی اور بے مزہ لگی، اس نے اپنا دل سنبھال کر اٹھایا، اس نے کتنے ہی آستانوں پر اس چکناچور شیشے کے ٹکڑے کو جاکر رکھا، مگر کوئی مرہم، کوئی دوا ایسی نہ ملی جو ان ریزوں کو جوڑ دیتی اس لئے وہ اب بھی اپنا کنوارا دل لئے پھرتا ہے۔ کسی دل والی کی تلاش میں۔

اس نے دل والیوں کو رنڈیوں کے کوٹھوں پر ڈھونڈھا۔ گندی گلیوں میں گھومنے والیاں، ٹکسیائیوں میں تلاش کیا۔ ریڈیو اسٹیشن پر گانے والی حسیناؤں اور آرٹسٹوں میں ٹٹولا، ہسپتالوں کی نرسوں میں بھی جستجو کی۔ فلمی پریوں کی گپھاؤں میں بھٹکا ایکسٹرا لڑکیوں کی جھرمٹ میں بھی جھانکا۔ جاہل گاؤں کی کنواریوں ہتڑک کی کوٹنے والیوں، مچھیرنوں، بھٹیاریوں کے آگے بھی ہاتھ پھیلایا۔ ڈرائنگ روم میں رہنے والی اور ہال روم میں تھرکنے والی شریف زادیوں سے بھی بھیک مانگی۔ مگر اسے دل والی کہیں نہ ملی، لاکھوں ہی گھونگھٹ پلٹ ڈالے، مگر وہی عورت وہی ساس سسر کی بہو، وہی ان کے ہی بچوں کی ماں دکھائی دی،

میری بھابھی سب سے بڑی سہی مگر زندہ عقلمند ہرگز نہیں۔ اس نے

میاں کو جھوٹے بہلاوے کبھی نہ دیئے، جیسے پہلی ہی رات کو وہ سمجھ گئی ہو —— کہ اپنی جان گھسانا حماقت ہے۔ ان تلوں میں تیل نہیں۔ اور وہ دنیا سے جی کڑا کر کے کالے کلوٹے، ٹیڑھے، بھینگے بچے تو خود بخود اس کے پیٹ میں تعمیر ہوتے رہے۔ وہ تو ابکائیاں لینے اور بدوضع بننے کے سوا کچھ بھی نہ کرتی —— اور یہ بچے میرے بھیا سے انتقام لینے کا مفید آلۂ کار ثابت ہوئے۔ جب ناک چاٹتے، ننگ دھڑنگ بسورتے ہوئے کینچوے کسی محفل میں میرے بھیا کو چھو دیتے تو وہ ایسے اچھل پڑتے جیسے بچھو نے چٹک لیا ہو۔ اور جب بھولے سے کوئی احمق مہمان گھر میں گھر جاتا تو یہی تہذیب اور نفاست کے قاتل، ادب اور سلیقہ کے دشمن اس کی چھاتی پر کودوں ڈال کر اس کو ڈوب مرنے کی ترغیبیں دیا کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ گھر کے میلے بچھونے، میلے فرش اور چپلندے برتن ایک نفیس دماغ روح کو ابدی مرگھٹ میں سلگانے کے لئے کافی نہ پا کر میری بھابی نے جملہ ترکیبوں اور خوش گفتاریوں کے زرین نسخے استعمال کر کے آنے جانے یا مستقل رہنے کے شوقین رشتہ داروں کا سلسلہ بھی منقطع کر دیا ہے۔

اسی لئے تو بیچارہ دل دالی کی تلاش میں زر زمین لٹاتا پھرتا ہے، کبھی کبھی اسے کوئی محبوبۂ دلنواز مل ہی جاتی ہے وہ اسے لے کر ایک نئے بنگلہ میں ایک نئی امید کے بھروسے پر ایک نئی دنیا بنا ڈالتا ہے۔ مگر اس بوسیدہ محور پر گھومنے کی عادی یہ دنیا جلد ہی پرانی ہو جاتی ہے۔ وہ محبوبۂ دلنواز موقع پا کر اس کا فرنیچر فروخت کر کے مکان پگڑی پر اٹھا کر، حتیٰ کہ اس کے کپڑے بھی اپنے نئے عاشق کے لئے لے کر بھاگ جاتی ہے۔ اور وہ پھر ویسا ہی لنڈورا اور یتیم رہ جاتا ہے۔

ویسے بھی اسے عشق راس نہیں آتا۔ جہاں کے لوگ آوارگی کرتے ہیں مرکھنیاں کسی کے گلے میں نہیں لٹک جاتیں وہ تو اگر بھولے سے بھی کسی کی طرف مسکرا کر دیکھ لے تو وہ عورت فوراً "حاملہ" ہو جاتی ہے اور اس کی جان پر ایک عدد تحفہ نازل کر دیتی ہے۔ جیسے وہ بلی کے گو کی طرح جگہ جگہ چھپاتا پھرتا ہے وہ اپنے جائز بچوں سے ذرا نہیں شرماتا۔ مگر اس کی علتوں سے اس کی عزت پر حرف آنے کا خطرہ ہے، وہ بڑا باعزت ہے نا۔

وہ اپنی اس مصیبت کو دنیا کی سب سے بڑی آفت سمجھتا ہے۔ جب اس کے دل کی دنیا اجاڑ پڑی ہے تو لوگوں کو بھوک، مہنگائی اور بیکاری جیسی بے مصرف چیزوں کے بارے میں سوچنے کا کیا حق ہے دل ہے تو سب کچھ ہے۔

آپ سمجھیں گے کہ وہ کوئی جنسی مریض ہے۔ عورت کا بھوکا ہے۔ جی نہیں اس ظالم عورت کی وجہ سے تو اسے بارہا شدید قسم کی بدہضمی بھی ہو چکی ہے۔ تو بات دراصل یہ ہے کہ وہ ایسے ماحول کی پیدائش ہے جہاں غمِ دنیا کو غمِ عقبیٰ کی آڑ میں چھپانا سکھایا جاتا ہے۔ جہاں ہر جسمانی محرومی کا الزام نصیب کے سر اور روحانی تشنگی کا ٹھیکہ معشوقہ کے ذمے، وہ قسمت کے پیچھے ڈنڈا لے کر پڑا ہوا ہے۔ ایک دن اسے نصیب دبکا ہوا کہیں مل جائے گا۔ تو وہ اس کا سر پاش پاش کر دے گا۔ پھر وہ ہوگا اور اس کی محبوبہ، لیکن اسے اتنا بھی نہیں معلوم کہ اس کا نصیب اس کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا ہے۔ اور اس کی چربی چڑھی آنکھوں کو کبھی نظر نہ آئے گا۔

اور ان کڑوے کسیلے ماں باپ اور فرسودہ نظام کے سائے میں پون درجن بچے پروان چڑھ رہے ہیں۔ آنے والی پود اگ رہی ہے۔ اور زندگیاں سانچوں

میں ڈھل رہی ہیں۔ نامعلوم منزل تک گھٹنے کے لئے دنیا میں تلخی اور افلاس کی پال پوس کرنے کے لئے۔

یہ میری دوسری بھابھی ہے۔ میرے بھائی کی انمول دلہن، اس کی قسمت کا چمکتا دمکتا سورج، اس کی مشعل راہ، میرا بھائی بڑا تقدیر والا ہے۔ اس نے ایک غریب کے گھر جنم لیا، دیوں کی ادھ مری روشنی میں پڑھ پڑھ کر ایک دن جب روشن ستارے کی طرح جگمگانے لگا تو ایک بڑی مچھلی آئی اور اسے ثابت نگل گئی۔

جوں ہی اس نے اول نمبروں سے بی، اے پاس کیا، نواب گھمن کی نظر التفات اس پر پڑ گئی۔ نہ جانے کدھر کے رشتے ناتے جوڑ توڑ کر پروفیسروں کے ذریعہ کانٹا مارا، اور دیکھتے ہی ایک چھوڑ ہزار جان سے فریفتہ ہو گئے۔ پھر اسے اپنی سب سے چہیتی باندی کی سب سے لاڈلی بیٹی کو بخش دیا۔ بادتہیرا بھید کے، مگر ایک طرف تو تھی نواب زادی، اور انگلینڈ جانے کا خرچہ اور دوسری طرف کھوسٹ باپ اور اپاہج ماں اور بن بیاہی بہنوں کی پلٹن اور ادھ پڑھے بھائیوں کی فوج، ظاہر ہے کہ بازی بڑے حلق والی مچھلی کے ہاتھ رہی۔ اور بقیہ جونکیں منہ دیکھتی رہ گئیں۔ جٹ منگنی پٹ بیاہ۔ اماں کو سمدھن بننے کا شوق، بہنوں کو بنک بنانے کی تمنا دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ اور پوت پتنگا بن کر سات سمندر پار اڑ گیا۔

اماں نے جی پر پتھر رکھ لیا تھا کہ بلا سے بڈی نیچی ہے تو جہیز ہی سے آنسو پچھ جائیں گے۔ ماشاء اللہ اتنے سامان سے پلٹن کے دو تین سپاہی تو بیس ہو جائیں

گے۔ دولھا کی سلامی سے ہی دو تین بھائیوں کی ناؤ پار اتر جائے گی۔ مگر سارے ارمان سارے حوصلے پھر سے اڑ گئے۔ جب نواب کی ایک کوٹھی دلہن کا میکہ اور دوسری کوٹھی سسرال بنی اور بہو — ایک کوٹھی سے دوسری کو بیاہ دی گئی انگلینڈ سے لوٹ کر دولھا بیاہ کر سسرال چلا گیا۔ اور اماں باوا نئے سرے سے دوسرا پودا سینچنے پر جٹ گئے، پھر کسی دن اس پودے کے چکنے چکنے پات کسی باغبان کو نظر آ گئے تو وہ اسے بھی گھورے سے سمیٹ کر "اپنے سمر ہاؤس" میں لے جا کر رکھ دے گا، اور اماں باوا ایڑیاں رگڑتے، آخری منزل کو جا کر پکڑ لیں گے

اب یہ پہلا پودا اپنے سسر کی ریاست میں کسی مفت خورے کے عہدے پر فائز ہے، علاوہ تنخواہ کے موٹر، گھوڑا گاڑی، کوٹھی، بنگلہ، نوکر چاکر، اور ایک عدد نواب زادی اسے ملی ہوئی ہے۔ صبح اٹھ کر دربار میں تین سلام جھاڑ چکنے کے بعد وہ دن بھر کوٹھی میں پڑا اینڈتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی اسے ایسا بھی محسوس ہوتا ہے۔ جیسے اس کی حیثیت افزائش نسل کے لئے استعمال کئے جانے والے سانڈ سے زیادہ نہیں۔ جو تھان پر بندھا اگلی ہوئی قے کی جگالی کئے جا رہا ہے اس کی بیوی یعنی نواب زادی کبھی اس کے غلیظ گھر نہ آتی، مگر جب بوڑھے باپ نے دنیا کی جنگ سے عاجز آ کر ہتھیار ڈال دیئے تو وہ معہ اپنے پورے تام جھام کے دو گھڑی کو آئی، اس بے چارے نوابی داماد کی شرم کے مارے بری حالت تھی۔ جیسے گورنر یا وائسرائے کی سواری آ رہی ہے۔ تو ایک صاف سی سڑک چن کر جھنڈیاں لگا دی جاتی ہیں۔ تاکہ وائسرائے سمجھے کہ سارا ملک ایسا ہی صاف اور جھنڈیوں سے سجا ہوا ہے۔ اس طرح کا سارا کوڑا کرکٹ نظروں سے اُوجھل

رکھ دیا گیا، بیت اٹھنے سے پہلے ہی نواب زادی اٹھ کر چل دیں اور ساتھ ساتھ وہ داماد بھی۔

مگر بڑے حساس دل کا مالک ہے۔ وہ سب کچھ سمجھتا ہے، اور اس کے دل پر برف کے گھونسے ہر دم لگا کرتے ہیں، اس لئے وہ جلد از جلد ماحول میں سمانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اور خود فراموشی کے لئے شراب پیتا رہتا ہے۔ تب وہ سب کچھ بھول جاتا ہے کہ سہانے موسم آ گئے ہیں۔ اور آس پاس کے رنگین مزاج سیر و شکار کے لئے آ جا رہے ہیں۔ اس کی بیوی دوسری نواب زادیوں کی طرح ہرنی بن کر چوکڑیاں بھر رہی ہے۔ وہ خود تین سلام جھاڑا کرتا ہے۔ آرام دہ کمرے میں بے سر و پیر سے بے خبر پڑا رہتا ہے۔ اب تو اسے رفیق زندگی کی آنکھوں میں سے گزرتے ہوئے سوال بھی نہیں جگا سکتے۔ وہ یہی تو کہتی ہے کہ "تمہارا مصرف کیا ہے؟ میرے باپ کی جلد بازی نے تمہیں اس جنت ارضی میں لا ڈالا ہے۔ اسے غنیمت جانو۔ جو یہ نہ ہوتا تو جوتیاں چٹخاتے پھرتے"۔ ایسے موقع پر اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ دنیا کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر دے پٹخے۔ اور.....

مگر وہ اس خیال کو دماغ میں جڑ پکڑنے سے پہلے اکھاڑ پھینکتا ہے، دینا چاہتی ہے کہ وہ انگلینڈ سے کوئی ڈگری یا ڈپلوما تو نہ لا سکا۔ اس کے جاتے ہی صاحبزادی صاحبہ کو دل کے دورے پڑنے لگے۔ اور انھوں نے رو رو کر اسے واپس بلوا لیا۔ اس لئے بے چارے کی حالت ایسی نیم پخت روٹی جیسی ہے۔ جو قبل از وقت توے سے پھسل کر گھی میں آن گری ہو۔ اوپر سے کاہلی اور بیکاری کی پھپھوند نے اسے اور بھی بے مصرف بنا دیا۔ وہ ایر کنڈیشن کمروں میں سو سو کر

اپنی پرانی کچی کھپریل سے کانپنے لگا ہے۔ فلش کا عادی ہو کر اسے غلیظ سنڈاس کے خیال سے بخار چڑھتا ہے۔ اس کی قسمت کا ستارہ بلندیوں پر ٹمٹما رہا ہے۔ جسے پکڑنے کے لئے وہ آوارہ بگولوں کی طرح سرگرداں ہے۔

اور جب وہ بہت تھک جاتا ہے تو غصہ میں آکر وہسکی کی مقدار پیگ میں دُگنی کر کے پرسکون جمائیاں لینے لگتا ہے، یہی اس کی کشمکش ہے اور یہی زندگی کی جدوجہد نمک کی کان میں جاکر وہ بھی تو نمک کا کھمبا بن چکا ہے۔

جب ان نمک کے تودے کی کانوں پر پہاڑوں کی چوٹ پڑے گی اور ان کے پرخچے اڑا کر روٹیوں میں گوندھ ڈالے جائیں گے تو اس خاص نمک کے تودے کی روٹی نمکین نہیں بلکہ کرکری ہوگی۔ پھر اس کرکری روٹی کا نوالہ بھی تھوک دیا جائیگا

میری ایک اور بھابی بھی ہے۔ یہ تعلیم یافتہ کہلاتی ہے، اسے ایک کامیاب بیوی بننے کی مکمل تعلیم ملی ہے، وہ ستار بجا سکتی ہے۔ ٹینس کھیلنے، موٹر چلانے اور گھوڑے کی سواری میں مشاق ہے، بچوں کی پرورش آیا سے بخیر و خوبی کروا سکتی ہے بیک وقت سو ڈیڑھ سو مہمانوں کی آؤ بھگت کر سکتی ہے، میرا بیرا لوگ کو اپنی نگرانی میں لے کر، بڑے لاڈ پیار سے اس کی حسین ماحول میں تربیت ہوئی۔ اور جب خدا رکھے سن بلوغ کو پہنچی تو اس کے روشن خیال والدین نے اس کے حضور میں ہونہار امیدواروں کی ایک رجمنٹ کو پیش ہونے کی اجازت دے دی۔ ان میں آئی سی، ایس بھی تھے۔ اور پی۔ ایس سی بھی۔ حسین اور تعلیم یافتہ بھی تھے۔ بدصورت اور دودھاری گائیں بھی۔ اشرفیوں کے تھیلوں کے ساتھ ساتھ منہ کا مزہ بدلنے والے کچھ ادیب اور شاعر بھی۔ اور پھر اس سے کہہ دیا کہ بیٹی تیرے آنکھیں بھی ہیں۔

اور ناک بھی، خوب ٹھوک بجا کر ایک بکرا چھانٹ لے۔

سو اس نے خوب جانچ پڑتال کر ایک اپنے ہی پلے کا بھاری بھرکم چن لیا، اور اس پر عاشق ہو گئی۔ جس کی داد اس کے والدین نے عظیم الشان جہیز کی صورت میں دی۔

لوگ اس ہنس اور ہنسنی کے جوڑے کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اور وہ بھی شدت الفت سے بیتاب ہو کر ایک دوسرے کو "ڈارلنگ" کہتے ہیں۔

دونوں میاں بیوی ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ ان کے مزاج یکساں پسند اور ناپسند یکساں، غرض ہر بات یکساں ہے۔ دونوں ایک ہی کلب کے ممبر ہیں۔

دونوں ایک ہی سوسائٹی کے چہیتے فرد............ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے اتنی شدید قسم کی نفرت ہے کہ وہ ایک دوسرے کی صورت مہینوں نہیں دیکھتے۔ فرصت ملتی ہی نہیں۔

میاں کا ایک دوسرے اعلیٰ پروفیسر کی بیوی سے مشہور و معروف قسم کا عشق چل رہا ہے۔ اور بیوی اس کے ایک ہمعصر سے مانوس ہے۔ جس کی بیوی اس کے ایک ہمعصر سے مانوس ہے۔ جس کی بیوی اپنی سہیلی کے میاں سے اٹکی ہوئی ہے۔ یہ سہیلی ایک سارجنٹ کے دام الفت میں گرفتار ہے۔ جس کی اپنی بیوی ایک بوجھل سے سیٹھ کے پاس رہتی ہے۔ جس کی پرانی چیچک رو بیوی اس کے منیجر سے اُلجھی ہوئی ہے۔ جو اینگلو انڈین لڑکیوں کے چکر میں پڑا ہوا ہے جو لڑکی کے ذعم..... اُونہہ چھوڑیئے بھی کیا فائدہ دخل در معقولات سے میرے بال نائی

کے پاس، نائی کا استرہ میرے پاس، میرا استرہ گھسیارے کے پاس۔ اس طرح یہ زنجیر ایک حلقہ کے منہ میں دوسرے کی دم لئے دنیا کے گرد چکر کاٹ رہی ہے میری بھابھی بھی اس زنجیر کا ایک حلقہ ہے اور وہاں جب تک لٹکی رہے گی جب تک زنجیر کرۂ ارض کو جکڑے رہے گی۔

اور میری تیسری بھابی تو جگ کی دلہن ہے۔ وہ اس سڑک کی مانند ہے جس پر سب چلتے ہیں۔ اس چھاؤں کی طرح ہے جو ہر تھکے ماندے کو اپنی آغوش میں تھپکیاں دے کر خود فراموشی کے اسباب مہیا کرتی ہے۔ وہ ساجھے کی ہانڈی ہے۔ جو آخر میں چوراہے پر پھوٹے گی۔ وہ جنھیں منہ کا مزہ ۔۔ بدلنے کے لئے نعمت خانہ میں مصالحہ رکھنے کی توفیق نہیں، وہ اس صلائے عام سے فائدہ اٹھاتے ہیں

وہ روز شام کو نئے دولہا کی دلہن بنتی ہے۔ اور صبح کو بیوہ ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی ان بہنوں سے کم خوش نصیب ہے جو اللہ کی دین سے ایک شب میں دس بارہ بار دلہن بنتی ہیں۔ دس براتیں چڑھتی ہیں، اور دس بار رانڈ ہوتی ہیں بعض لوگ ناک چڑھی پڑوسنوں کی طرح اس پر ٹیڑھی ٹیڑھی نظریں ڈالتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ کچھ پنچ ہے۔ کوئی گناہ کر رہی ہے۔

مگر خود اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون سا پاپ کر رہی ہے۔ دنیا میں کیا نہیں بکتا۔ اور کیا نہیں خریدا جاتا۔ جو لوگ اسے جسم بیچتا دیکھ کر بلبلا اٹھتے ہیں کیا لوگ پیسے کے عوض اپنے دماغ نہیں بیچتے، اپنے تخیلات کا سودا نہیں کرتے۔ اپنا ضمیر نہیں بیچتے۔ معصوموں کا خون بھی تو آٹے میں گندھ کر بکتا ہے۔ کاریگر کا گاڑھا پسینہ بھی تو کپڑے کے تھان رنگ کر فروخت کیا جاتا ہے۔ ایک کلرک کی ساری زندگی

چالیس روپیہ مہینہ پہ بک جاتی ہے۔ ایک ٹیچر کی پوری عمر کا سودا بھی تو اتنے ہی داموں پر ہوتا ہے ــــــــــــــــــ تو پھر اس جسم خاکی کے لئے کیوں اتنی لے دے۔

اور اس کا باپ کالے بازار کا معزز ستون۔ اس کا بھائی ناجائز طریقہ سے ناجائز لوگوں تک پہنچاتا تھا۔ اس کا دوسرا بھائی پولیس کا ذمہ دار فرد ہوتے ہوئے بھی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کیا کرتا تھا اور دنیا ان سب کو گلے سے لگائے بیٹھی ہے۔ وہ بھی تو آخر انہی میں سے ایک ہے۔ جہاں آوے کا آوا ٹیڑھا ہے وہاں اس کی بھی کھپت ہونی چاہئے۔

وہ کوئی پشتہا پشت کی رنڈی نہیں۔ اس میں اس کا کیا قصور، وہ آرٹ کی خدمت کرنے فلم لائن میں گئی اور وہاں سے لوگ نہ جانے کب اور کیسے اسے دھیرے دھیرے اس کونے میں کھینچ لائے۔ اس نے یہی تو کیا کہ فلم اسٹار بننے کے لئے سر ٹپکایا۔ فائینسر سے لے کر ــــ گھر کی خاک چھانتے چھانتے وہ خود چھلنی بن گئی۔ اس گڑبڑ میں وہ نہ جانے کون سا ریہرسل غلط کر گئی جو بجائے آسمان فلم کا درخشاں ستارہ بننے کے وہ یہاں سڑک کے کنارے ٹمٹمانے لگی۔

یہ نہیں کہ اس نے شادی نہ کی ہو۔ اس نے اس کوچہ کی بھی دشت پیمائی کر کے دیکھ لی۔ مگر شادی کے چند مہینہ بعد اس کا میاں حسب معمول ادھر ادھر جانے لگا۔ وہ شاید تنگی، ترشی میں بھی گزر کر لیتی، مگر وہ تو جتنے پیر سکوڑتی گئی، اتنی ہی وہ چادر کترتا گیا۔

سوائے بیوی بننے کے اسے کوئی ہنر نہ آتا تھا، وہ چاہتی تو تیس پینتیس کی استانی گیری کر لیتی۔ مگر اتنے روپے سے تو اسے شمپو کا خرچ چلانے کی بھی عادت نہیں تھی۔ یا اسپتال میں نرس بننے کی کوشش کرتی اور ساٹھ روپے کے عوض خون، پیپ، کھانسی، بخار، قے اور دست، قلابازیاں کھاتی لیکن وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس قسم کی حماقتوں میں جان کھپانے کا شوق اس کے خمیر میں حلول نہیں۔ مجبوراً اسے فلم کے دروازے پہ دستک دینی پڑی۔

رنگین فلم ہندوستان میں بنتے تو شاید اس کا سدا شباب رنگ کچھ برق پاشیاں کر سکتا۔ لیکن ان کالے سفید فلموں میں چوڑی چکلی ناک اور چندھی آنکھوں نے اس کی لٹیا ڈبو دی۔ دو چار تھکی ہاری فلمیں بنا کر وہ فائینسر کی آغوش سے گر کر ڈائرکٹر کے پاس آئی اور وہاں سے پھسلی تو ہیرو اور سائڈ ہیرو کے متھے چڑھی۔ اس کے بعد کیمرہ مین ـــ لپکا، وہاں سے جو ٹپکی تو قعر گمنامی میں کھسک گئی۔ اور جب آنکھ کھلی تو اس نے خود کو اس بازار حسن میں معلق پایا۔ مگر اب وہ بڑی سمجھ دار ہو گئی ہے۔ اپنے گاہکوں کو بڑی ہوشیاری سے ناپتی تولتی ہے، اگر کسی دن کوئی موٹی مرغی بدصورت بیوی اور غلیظ بچوں کی ہنکائی آ گئی تو وہ اسے اپنا مستقل گاہک بنا ڈالے گی۔ اور سرکار سے اس استقلال کا سارٹیفکٹ حاصل کر کے کالے بازار کے آئندہ ستون تعمیر کرنا شروع کر دے گی۔

یہ ہیں آدم اور حوا کے جانشین، تخلیق کے علمبردار ادھ دنیا کی گاڑی کو چلانے والے جنہیں آج سے لات گھونسے سے آگے پیچھے دھکیل رہے ہیں۔

مگر ٹھہریئے میری ایک اور بھابھی ہے۔ پردہ نہ جانے کہاں ہے۔ میں نے ایک آدھ بار اس کی جھلک دیکھی ہے۔ کبھی اس کے ماتھے پر ڈھلکے ہوئے زرتار آنچل کو دیکھا ہے۔ مگر اسے پرچم بنتے نہیں دیکھا، ان کی دودھ ایسی پیشانی پر محنت کی افشاں چنی دیکھی ہے مگر اس افشاں میں اودے، پیلے، نیلے سب رنگ ہیں اور سہاگ کی سرخی کی جھلک نظر نہیں آتی، میں نے اس کی حسین انگلیاں تو دیکھی ہیں مگر انہیں الجھے ہوئے بالوں کے پیچ وخم سلجھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس کی سانولی شام کو شرمانے والی زلفوں کی گھٹاؤں کو دیکھا ہے۔ مگر انہیں کسی کے تھکے ہوئے شانوں پر پریشان ہوتے نہیں دیکھا۔ میں نے اس کا چکنا میدے کی لوئی جیسا پیٹ تو دیکھا ہے مگر اس میں ابھی نئی امید کے پودے کو پروان چڑھتے نہیں دیکھا، میں نے اس کی چتونین دیکھی ہیں مگر انھیں شمشیر بنتے نہیں دیکھا۔

سنتے ہیں سنہرے دیسوں میں وہ آن بسی ہے اور ماتھے کی افشاں امر سہاگ کا سیندور بن چکی ہے۔ اس کی مہکتی زلفیں چوڑے چکلے شانوں پر بکھری ہیں..... اس کی پتلی پتلی انگلیاں الجھے بال ہی نہیں سلجھا رہی ہیں بلکہ تلواروں کی دھار پر اپنی تیکھی چتونوں سے سان رکھ رہی ہیں۔

دور جانے کی ضرورت نہیں..... یہیں بہت قریب میرے پڑوس میں تلنگانہ کی البیلیاں جی دار جوانوں کی آرتیاں اتار رہی ہیں۔ اور ان کے ہتھیاروں پر عقیدت کے پھول چڑھا کر سیندور کے ٹیکے لگا رہی ہیں۔

مفلسُ مووی ٹون

خواجہ احمد عبّاس

مفلس موؤٹون

(پہلا منظر)

سٹیج پر بالکل اندھیرا ہے دھیرے دھیرے روشنی بڑھتی جاتی ہے۔۔۔

۔۔۔ نقیب کی آواز سنائی دیتی ہے۔

نقیب۔ "با ادب با ملاحظہ ہوشیار، شہنشاہ موسیقی، سنگیت سمراٹ میاں تان سین کی سواری آتی ہے۔ اگر اپنی جان کی سلامتی چاہتے ہیں تو سب بے سُرے اس راستے سے ہٹ جائیں۔۔۔۔"

(جب روشنی ہوتی ہے تو دربار موسیقی سجا ہوا نظر آتا ہے۔ موسیقاروں اور سازندوں کے جلوس کے ساتھ میاں تان سین آتے ہیں اور تخت پر جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ برابر کا تخت خالی ہے)

تان سین۔ (برابر کے تخت کو خالی دیکھتے ہوئے) "آج بانسری بے آواز ہے۔

معلوم ہوتا ہے ہمارا پیارا چھلیا نہیں آیا۔ . . ."

درباری۔ "جی سرکار؟ یہ چھلیا کون ہے؟"

تان سین۔ "وہی جس کے بن نا باجے بانسریا رے ـــ"

(بیجو باورے کا ترانہ سنائی دیتا ہے۔ آواز قریب آتی جا رہی ہے)

تان سین۔ "اہاہا۔ آگیا۔ آگیا۔ ہمارا پیارا متوارا بیجو باورا" (بیجو گاتا ہوا داخل ہوتا ہے تان سین اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں)

بیجو۔ "سلطان الموسیقی ـــ۔ یہ کیا غضب؟ آپ اور مجھ ناچیز کے لئے اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو جائیں۔ کہاں آپ اور کہاں میں؟ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔"

تان سین۔ "یہ تمہارا انکسار ہے بیجو۔ ورنہ ہم تو شہنشاہ اکبر کے بھرے دربار میں تم سے بار مان چکے ہیں۔"

بیجو۔ ـــ اوہ! ـــ۔ وہ تو فلمی پلے بیک کا شعبدہ تھا سلطان الموسیقی۔ ورنہ میری کیا مجال . . . ."

تان سین۔ (بات کاٹتے ہوئے) "خیر جو بھی ہو ـــ آؤ بیٹھو ـــ آج ہم تمہیں ایک حیرت انگیز چیز دکھاتے ہیں ـــ ایک معجزہ ـــ چمتکار" (تالی بجاتا ہے نوکر ایک عجیب ڈیزائن کا ریڈیو لاتا ہے)

بیجو۔ (حیرت سے دیکھتے ہوئے) یہ کیا گورکھ دھندا ہے، سلطان الموسیقی؟"

تان سین "یہ ایک نیا آلہ ہے جسے ہمارے فرنگی دوست مارکونی صاحب نے دیا ہے۔ اور جس کی مدد سے ہم جنت میں بیٹھے بیٹھے دنیا کا سب حال سن سکتے ہیں آج ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ مرکزِ موسیقی، سنگیت بھومی بھارت ورش میں

تان سین اور بیجو کے بعد سنگیت کلا نے کتنی ترقی کی ہے۔"

ریڈیو کی آوازیں۔ (سوئی گھمانے پر ایک کے بعد مختلف اسٹیشنوں کے پروگرام گڈمڈ سنائی دیتے ہیں) یہ آل انڈیا ریڈیو ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ملے جلے گانے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فرمائشی پروگرام ۔ ۔ ۔ ۔ سیلون ریڈیو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک دو تین ۔ ۔ ۔ ۔ مل کے پیو اودل ۔ ٹین ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میک لین ۔ ۔ ۔ ۔ میک لین ۔ ۔ ۔ چکا بوم بوم ۔ ۔ شعلہ جو بھڑکے ۔ ۔ ۔ بستر بچھادیا ہے ترے گھر کے سامنے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آنا میری جان سنڈے کے سنڈے ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ وغیرہ۔"

(تان سین، بیجو اور درباری پہلے حیرت اور پھر حقارت کے ساتھ ان آوازوں کو سنتے ہیں)

تان سین۔ بیجو! یہ سب کیا ہنگامہ ہے :۔ ہم موسیقی سن رہے ہیں یا کسی چڑیا گھر میں مرغوں اور کتوں بلّوں کی لڑائی ہو رہی ہے ۔ ؟"

ریڈیو (گویا تان سین کا جواب دیتا ہے) "ابھی ابھی آپ فلمی گیتوں کے ریکارڈ سن رہے تھے آخری ریکارڈ مفلس مووی ٹون کے پچھلے فلم "نیا راگ" کا تھا

تان سین۔ "بند کرو یہ سب بکواس ۔ ۔ ۔ ۔ نیا راگ ؟ — لاحول ولا قوۃ — اگر یہ راگ تھا تو میں نے تو ساری عمر بھاڑ ہی جھونکا۔ کیوں بیجو؟ تمہیں اس شور و غوغا میں کوئی راگ سنائی دیتا تھا ۔ ۔ ۔ ؟"

بیجو۔ "سلطان الموسیقی ۔ ۔ ۔ ۔ راگ تھا تو کوئی ضرور ۔ ۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایمن کلیان کی شادی زبردستی میاں کی توڑی سے کردی گئی ہو اور اس سے کوئی نہایت بے سری اولاد پیدا ہوئی ہو ۔ ۔ ۔ ۔"

تان سین۔ ہمیں یقین نہیں آتا کہ بھارت بھومی میں جہاں ادم کے پاکیزہ سر سے سنگیت
نے جنم لیا جہاں شہنشاہوں کے درباروں میں موسیقی پروان چڑھی وہاں
راگ راگنیوں کی یہ درگت بنائی گئی ہو۔۔۔۔"

ایک درباری "سرکار۔ ضرور اس میں فرنگیوں کے اس جادوئی باجے کا ہاتھ ہے۔۔۔"

تان سین۔ (کچھ سوچکر) "تو پھر۔۔۔ کیوں نہ ہم خود دنیا میں جاکر دیکھ آئیں کہ ہمارے
بعد بھارت ورش میں سنگیت کلا پر کیا بیتی۔۔۔ بیجو ۔۔ اتم اندر پوری کی
اس سنگیت سبھا کو سنبھالو ۔۔ میں چلا۔۔۔"
(روشنی دھیرے دھیرے غائب ہوتی جاتی ہے)

بیجو۔ "لیکن اس نئے بھارت کے لئے سنگیت کی کھوج میں آپ کہاں کہاں
جائیں گے۔۔۔۔۔"
(تقریباً اندھیرا ہو چکا ہے)

تان سین۔ (اندھیرے میں سے آواز آتی ہے) "سنا نہیں تم نے۔۔۔ مفلس مووی ٹون
جہاں نیا راگ بنتا ہے ۔۔ میں بھی وہیں جاتا ہوں۔"
(مکمل اندھیرا چھا جاتا ہے)

(دوسرا منظر)

(چند لمحوں تک اسٹیج پر مکمل اندھیرا۔ پھر آہستہ آہستہ روشنی بڑھتی جاتی ہے۔
اب دربار موسیقی کی بجائے مفلس مووی ٹون فلم کمپنی کے پروڈیوسر کا دفتر
نظر آتا ہے پروڈیوسر کرسی پر بیٹھا مکھیاں مار رہا ہے۔)

پروڈیوسر (ہوا میں مکھیاں مارتے اور گنتے ہوئے) چھبیس ۔۔ ستائیس ۔۔ اٹھائیس

——انتیس۔ " (ایک چھوکرا جو دفتر میں چپراسی کا کام کرتا ہے داخل ہوتا ہے"

چھوکرا۔ "کوئی آیا ہے۔"

پروڈیوسر۔ (خوش ہو کر) "کون؟ مدھوبالا؟"

(چھوکرا سر ہلا کر "نہیں" کرتا ہے)

پروڈیوسر۔ نرگس؟ ثریا؟ بینا رائے؟ گیتا بالی؟"

(چھوکرا ہر نام پر سر ہلا کر نہیں کرتا ہے)

چھوکرا۔ "نہیں صاحب وُہ تو کوئی مرد ہے،

پروڈیوسر۔ "لیکن وہ ہے کون اور کیا چاہتا ہے؟ شکل صورت، چال ڈھال، کاسٹیوم پراپرٹی اور میک اپ سے کیا لگتا ہے؟"

چھوکرا۔ "بال بڑھے ہوئے ہیں۔ دو مہینے سے حجامت نہیں بنوائی۔ اس لئے ہو سکتا ہے ایکٹر ہو!"

پروڈیوسر۔ (بددلی سے) "اوہ، ایکٹر!"

چھوکرا۔ "پان کھا کھا کر پیک تھوک رہا ہے۔ جیب میں تین پیسے والی پنسل اور سوا روپے والا فاؤنٹن پین ہے اس لئے رائٹر بھی ہو سکتا ہے۔"

پروڈیوسر۔ (بددلی سے) "رائٹر—؟ کہہ دو مجھے فرصت نہیں ہے۔"

چھوکرا۔ "لیکن صاحب سوچ لیجئے۔ میلی دھوتی پہنے ہوئے ہے۔۔۔ اس لئے۔۔۔

۔۔۔" بولتے بولتے رُک جاتا ہے۔

پروڈیوسر۔ "اس لئے؟"

چھوکرا۔ (جیسے بہت اہم راز کی بات کہہ رہا ہو) "اس لئے فنانسر بھی ہو سکتا ہے"

پروڈیوسر۔ (خوشی سے تقریباً بے ہوش ہوتے ہوئے) "فنا سر — ؟ ارے تو کھڑے

کھڑے میرا منہ کیا تک رہا ہے۔ بلا — بلا — جلدی سے۔"

(چھوکرا جانے لگتا ہے)

"مگر ٹھہر ٹھہر۔ پہلے ذرا میز تو صاف کر — چنے کے دانے بکھرے پڑے ہیں"

چھوکرا۔ (میز جھاڑتے ہوئے) "یہ چنے کے دانے نہیں ہیں صاحب۔ یہ تو مکھیاں

ہیں — مکھیاں!"

پروڈیوسر۔ "اچھا — اچھا — جلدی جا۔ سیٹھ صاحب کو بلا۔"

(چھوکرا باہر جاتا ہے۔ پروڈیوسر رجسٹر اور فائل کھول کر سامنے رکھ لیتا ہے

جیسے بہت مصروف ہے۔

(فلمی دلال داخل ہوتا ہے)

دلال۔ (پروڈیوسر کو مصروف پا کر کھنکارتا ہے۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) "اگر

آپ کام میں ہیں تو —"

پروڈیوسر۔ "کون ! اوہ آپ ! معاف کیجئے گا۔ میں پچھلی پکچر کے حساب دیکھنے میں مصروف

تھا۔ آپ نے تو ضرور دیکھی ہوگی "نیا راگ" کمبخت جہاں بھی چلی ہے ریکارڈ

توڑے ہی نہیں چکنا چور کر دیئے ہیں۔ جھانسی میں "جھانسی کی رانی" کو سلا دیا

دلی میں "انارکلی" کو بٹھا دیا۔ اور کلکتے میں "بیجو باورا" کے چھکے چھڑا دیئے ہیں۔

میں تو ڈسٹری بیوٹروں کے چیک وصول کرتے کرتے تنگ آ گیا ہوں۔

ابھی بیٹھا حساب کر رہا تھا، کہ کوئی سترہ لاکھ کا منافع ہونے والا ہے۔

انکم ٹیکس والے تو چمڑی ادھیڑ دیں گے۔ چمڑی۔"

دلال۔ "تو میں پھر کبھی۔۔۔۔" (اٹھ کر جانے لگتا ہے)

پروڈیوسر۔ (جلدی سے رجسٹر اور فائل نیچے رکھتے ہوئے) "نہیں نہیں۔ بیٹھئے بیٹھئے پدھاریئے تشریف رکھئے۔ آپ کے آنے سے تو مرجھائے ہوئے دلوں میں بہار انگڑائیاں لینے لگی ہے، چاند کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے۔ اور کوؤں کی کائیں کائیں کوئل کی سریلی پکار میں تبدیل ہوگئی ہے۔۔۔"

دلال۔ (حیرت سے) "جی ۔۔ ؟"

پروڈیوسر "جی کچھ نہیں۔ بے خیالی میں میں اپنی پکچر کا ڈائیلاگ بول گیا تھا۔ آپ کیا لیں گے کچھ ٹھنڈا، کچھ گرم؟ کیا پیش کروں؟ چائے۔ ؟"

دلال "جی کوئی ضرورت نہیں۔ میں ابھی چائے پی کر ہی آ رہا ہوں"

پروڈیوسر" ہاں تو فرمایئے۔ بمبئی آنا کب ہوا؟ آپ اس دھندے میں نئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے ذرا ہوشیار رہیئے گا۔ آج کل بہت سے ٹٹ پونجیے پروڈیوسر بس اسی تاک میں بیٹھے رہتے ہیں کہ کب کوئی فناسر پھنسے۔۔۔ ۔۔۔ اور وہ۔۔۔۔"

"فناسر؟"

پروڈیوسر" جی ہاں آپ جیسا کوئی سیٹھ!"

دلال۔ "سیٹھ؟ میرے جیسا؟ (ہنستا ہے) آپ تو مذاق کر رہے۔ میں تو بروکر ہوں صاحب بروکر۔ یعنی دلال۔ پکچروں کا دھندا کرتا ہوں۔"

پروڈیوسر (نہایت بددلی سے) "اوہ!"

دلال۔ بات یہ ہے کہ دلّی، یوپی، سی۔ آئی اور بنگال کی کئی پارٹیاں بالکل میری

میٹھی میں ہیں لیکن انہیں کوئی بڑی تگڑی پکچر چاہیئے۔ آپ کا اگلا پروگرام کیا ہے؟"

پروڈیوسر:" اوہ ۔ اگلا پروگرام ؟ وُہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھئی ویسے تو ہم نے فیصلہ کر لیا ہے ۔ کہ اگلی پکچر ٹیکنی کلر میں بنائیں گے تم جانتے ہو کہ آج کل زمانہ کلر مانگتا ہے مگر وہ — وہ — ولایت سے ڈینٹی لیٹر — نہیں نہیں میرا مطلب ہے جنسر ٹیڑ آنے میں دیر ہے ٹیکنی کلر کا کیمرہ لینے تو میں خود ولایت گیا تھا لیکن کیا ہوا کہ — کہ میں تو گیا سمندری جہاز سے ۔ ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہوئے میں ذرا گھبراتا ہوں ۔ اور راجو — یہ راج کپور ہے نا — اپنا ہی بچہ ہے اسے میں پیار سے راجو راجو کہتا ہوں ۔ پہلے اپنے ہاں ہی کام سیکھتا تھا ہاں تو اس نے جو سُنا میں ٹیکنی کلر کیمرہ لینے جا رہا ہوں تو وہ فٹا فٹ سے ہوائی جہاز میں وہاں پہنچ گیا اور جب تک میں وہاں پہنچوں اس نے کیمرہ ریزرو کرا لیا خیر کوئی بات نہیں اپنا ہی بچہ ہے سو ابھی تو وہ بنا رہا ہے ۔ — اجنتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

دلال ۔ " اور آپ ؟ ایلی فینٹا ؟"

پروڈیوسر:۔ (ہنس کر) " بڑے مزاقیہ معلوم ہوتے ہو تم ؟ — ہاں تو فی الحال بلیک اینڈ وہائٹ ہی کا پروگرام ہے ۔ پکچر سمجھو کہ فلور پر جانے والی ہے

دلال :۔ ہیروئن کون ہے ؟"

پروڈیوسر " کنٹراکٹ تو مدھو بالا سے پرانا کیا ہوا ہے لیکن سوچتا ہوں آج زمانہ نیو فیسز مانگتا ہے اس سے ایک نئی لڑکی آئی ہے" چھم چھم بالا " اسے لیا ہے

دلال :" اور ہیرو ؟"

پرڈیوسر۔ ہیرو کی بہت مشکل ہے۔ سنوی اتنی تگڑی ہے کہ راج کہتا ہے مجھے لو اور
دلیپ کا اصرار ہے مجھے اپنے لئے دونوں برابر ہیں۔ سوچتا ہوں اس جھگڑے
میں ہی نہ پڑوں۔۔۔۔ اس لئے۔۔۔۔"

دلاّل :۔ دیوآنند کو لے رہے ہیں؟"

پرڈیوسر:۔" ہاں دیو کو ہی لینے والا تھا۔ لیکن وہ اپنی نوتن کی پکچروں میں اتنا بزی
ہوگیا ہے کہ اب تو سوچتا ہوں کہ خود ہی کیوں نہ اس میدان میں کود پڑوں"

دلاّل : گویا کہ ہیرو آپ؟"

پروڈیوسر:۔" ہاں یہی سمجھو!"

دلاّل :۔" اور ڈائریکٹر؟"

پروڈیوسر:۔" بھئی میں تو دو ہی ڈائرکٹروں کا قائل ہوں۔ شانتا رام اور محبوب۔ یہ
دونوں کسی قیمت پر باہر پکچر بنانے کو تیار نہیں اس لئے میں نے سوچا۔ خود
ہی کیوں نہ ڈائرکٹ کرلوں؟"

دلاّل :۔" ہوں اسٹوری کس کی ہے؟"

پرڈیوسر:۔ (اِدھر اُدھر دیکھ کر)" وہ ریگل میں پکچر آئی تھی ؟ — من کی بزنس! بس
سمجھ جاؤ ہاں لیکن بات باہر نہیں جانی چاہیئے۔ اس میں چودہ گانے اور
دو ڈانس ڈال دیئے ہیں — ایک بندر بندریا کا ڈوئٹ رکھا ہے —
میں تیرا باندرا تو میری باندری — بالکل نئی چیز ہوگی۔"

دلاّل :۔ "میوزک ڈائرکٹر کون ہے؟ — وہ بھی آپ خود ہی ہیں کیا؟"

پرڈیوسر:۔" ارے بھئی نہیں۔ میں اس کا بالکل قائل نہیں کہ سارے کام خود ہی کر لوں دیئے

ٹیونیں وغیرہ تو میں خود ہی بنایا کرتا ہوں لیکن دوسروں کو بھی چانس دینا چاہیئے"

دلاّل۔ "بس تو کوئی نمبر ون میوزک ڈائرکٹر لے لیجئے —— پکچر کا بزنس میں کرائے دیتا ہوں

پرڈیوسر" نمبر ون میوزک ڈائرکٹر تو ہو گا ہی۔ کہو تو نوشاد کو لے لوں؟"

دلاّل۔ "ارے واہ —— پھر تو سمجھئے کل ہی پکچر سائن ہو گئی"۔

پرڈیوسر" بے چارہ جب ملتا ہے یہی کہتا ہے کہ آپ کے ساتھ ایک پکچر بنانے کی حسرت ہے"

دلاّل:۔ (خوش ہو کر) "بس تو پھر کام بن گیا"

پرڈیوسر" نا بابا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ جب تمہیں محبوب صاحب۔ سنی صاحب صادق صاحب۔ ان سب سے فرصت ہو تو مجھ سے بات کرو۔ مجھے تو ایسا میوزک ڈائرکٹر چاہیئے جو رات دن میرے ساتھ رہے۔ . . . صرف میرا کام کرے اسی لئے سی رامچندر کو بھی انکار کر دیا . . . ورنہ وہ بھی . . ."

دلاّل (کھڑے ہوتے ہوئے) "خیر آپ کی مرضی لیکن یاد رکھئے کہ آج کل پکچریں بکتی ہیں میوزک پر۔ یا تو کوئی اچھا میوزک ڈائرکٹر لے لیجئے یا کسی نئے آدمی کو لے کر دو چار پھڑکتے ہوئے گانے ریکارڈ کرا لیجئے۔ . . . بزنس میں کرا دوں گا"

وہ باہر جاتا ہے۔ پروڈیوسر اکیلا رہ جاتا ہے۔

پروڈیوسر۔ "میوزک ڈائرکٹر؟ میوزک ڈائرکٹر! نوشاد؟ اُوں ہوں۔ کئی پکچروں میں پھنسا ہوا ہے۔ سی رامچندر۔ برمن انیل بسواس بشنکر جے کشن سب چھ چھ پکچریں لئے بیٹھے ہیں۔ کوئی نیا آدمی چاہیئے۔

(چھوکرا اندر آتا ہے)

سمجھا بھولا ایک نیا میوزک ڈائرکٹر چاہیئے۔ جو اپنے گانوں سے ساری فلمی

دنیا میں آگ لگا دے۔"

چھوکرا۔ (کارڈ دیتے ہوئے) "تو یہ لیجئے صاحب! ایک نیا میوزک ڈائرکٹر آیا۔"

پروڈیوسر۔ (کارڈ لیتے ہوئے) "تان۔ ۔ ۔ ۔ سین۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سنگیت کار۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ یہ تو کوئی بنگالی جی نی لیس معلوم ہوتا ہے۔ بلاؤ۔ بلاؤ۔ ۔ ۔ ۔"

(تان سین داخل ہوتے ہیں)

تان سین۔ "نمستے!"

پروڈیوسر۔ نمستے نمستے۔ بیٹھو بھئی بیٹھو۔ بڑے وقت پر آئے ہو۔ کہو کسی پکچر میں میوزک دیا ہے؟"

تان سین۔ "میوزک؟"

پروڈیوسر۔ "ہاں ہاں میوزک۔ یعنی موسیقی سنگیت"

تان سین۔ "جی ہاں! سنگیت تھوڑا بہت جانتا ہوں"

پروڈیوسر۔ "کہو کچھ بھڑکتی ہوئی دھنیں بنائی ہیں؟"

تان سین۔ "جی — کوئی بھڑکتی ہوئی دھن تو نہیں بنائی تھی جس سے بجھے چراغ جل اٹھتے تھے اور تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔"

پروڈیوسر۔ اسے وہ تو تان سین فلم میں ٹرک فوٹوگرافی سے کیا تھا۔ ۔ ۔ کیا کہا کیا نام ہے تمہارا۔ ۔ ۔ ۔!

تان سین۔ "تان سین!"

پروڈیوسر۔ "دیکھو مسٹر، یہ تان وان سین نہیں چلے گا۔ خواہ مخواہ لوگ مذاق اڑائیں گے اور پھر جو بھی پبلسٹی میں یہ نام دیکھے گا سمجھے گا پکچر میں پکے گانے ہوں گے۔

ٹی. سین اچھا رہے گا میں ابھی مینجر سے کہتا ہوں، ابھی سے تمہارے بارے میں خبر چھپوا دے ــــ "مفلس موودی ٹون کا نیا سنگیت کار بنگالی جی نی ایس ٹی سین آنے والی فلم "مرلی والا شیام" کے لئے ایسی دھنیں تیار کر رہا ہے جنہیں وکٹوریہ والا. تانگے والا، اکے والا اور رکشا والا جاگتے ہوئے گنگنائے گا اور سوتے ہوئے بڑبڑائے گا"

تان سین۔ (کچے گانے کے انداز میں گاتے ہوئے) "مرلی والے شیام ــ ــ ــ"

پرڈیوسر۔ "بس ٹھیک ہے. یہ ہو اتھیم سونگ. آج کل ہر پکچر میں تھیم ہو یا نہ ہو تھیم سونگ ضرور ہونا چاہئے"

تان سین۔ "جی. میں کچھ سمجھا نہیں"

پرڈیوسر۔ تمہیں سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں. تم تو بس فوراً اس تھیم سونگ کو کمپوز کر ڈالو میں منشی مستانہ کو بلوا دیتا ہوں ان سے بول لکھوا لینا مگر یاد رکھو اصلی چیز ٹیون ہے، بول کچھ بھی ہوں ــ ــ ــ ــ اور اب میں چلا مس چھم چھم بالا کو ریہرسل کرانا ہے.

(روشنی دھیمی ہوتی جاتی ہے)

لیکن یاد رکھنا. پرسوں اس گانے کا ٹیک ساڑھے چھ بجے شام کو ــ ــ ــ "

(اندھیرا چھا جاتا ہے)

(تیسرا منظر)

(روشنی آہستہ آہستہ بڑھتی ہے. اب اسٹیج ایک ریکارڈنگ روم میں تبدیل ہو چکا ہے. جہاں ایک گانے کو ریکارڈ کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں سازندے اپنے اپنے سازوں کے سر ملا رہے ہیں. تان سین سازندوں کو ہدایات دیتے جا رہے

ہیں لیکن سازندے انہیں ایسی نظر سے دیکھتے ہیں جیسے ان کا میوزک ڈائرکٹر پاگل ہو
تان سین ایک پکے راگ میں گانا گاتے ہیں۔ جو ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ گانا ختم ہوتے ہی
پروڈیوسر چراغ پا ہو کر ساؤنڈ ریکارڈسٹ کے کمرے سے باہر نکل آتا ہے)

پروڈیوسر۔ "اے بڑا میوزک ڈائرکٹر بن کے آیا ہے یہ گانا ہے یا رونا؟"

تان سین۔ "اس کو راگ کہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔"

پروڈیوسر۔ (بات کاٹتے ہوئے) "ارے یہ مرتو راگ ہے ایسے دو چار گانے میری پکچر میں ہوئے تو وہ سیدھی شمشان بھومی پہنچ جائے گی۔ ۔ ۔ ۔"

تان سین۔ "دیکھئے جناب مت بھولئے آپ سنگیت سمراٹ تان سین سے بات کر رہے ہیں"

پروڈیوسر۔ "ارے جاؤ جاؤ۔ ایسے ایسے سمراٹ پانچ روپے روز پر ایکسٹراز میں بھرتی ہوتے ہیں۔ تم سین ہو، چکرورتی ہو، یا بھٹاچاریہ ہو۔ لیکن جو تم نے ابھی گایا ہے یہ گانا نہیں ہے"۔

تان سین۔ "ٹھہریئے، میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔"

پروڈیوسر۔ "کہو!"

تان سین۔ "آپ کو چینی بھاشا آتی ہے؟"

پروڈیوسر۔ "نہیں۔ پھر!"

تان سین۔ "پھر کچھ نہیں صرف یہ کہنا ہے کہ آپ کے لئے سنگیت بھی چینی بھاشا کی طرح ہے۔ اس پر بات کرنے سے پہلے کچھ سیکھ لیجئے — بس اب میں جا رہا ہوں۔"

(اتنے میں ایک اور میوزک ڈائرکٹر آجاتا ہے)

میوزک ڈائرکٹر۔ "ٹھہریئے ٹھہریئے مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے"۔

تان سین ۔ کیوں آپ کو بھی میرا گانا بکواس معلوم ہوتا ہے !"

میوزک ڈائرکٹر ۔ نہیں نہیں ۔ میں تو یہاں اپنی ریکارڈنگ کا پروگرام فکس کرانے آیا تھا
آپ کا گانا سن کر تو میں مست ہو گیا ۔"

تان سین ۔ (حیرت سے) "سچ ؟ تم میرا مذاق تو نہیں اڑا رہے ہو ؟"

میوزک ڈائرکٹر ۔ نہیں نہیں ۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ جیسے اسکول کے لڑکوں کو گرامر پڑھائی
جاتی ہے ۔ اسی طرح فلم انڈسٹری کے سب میوزک ڈائرکٹروں کو آپ کے
گانے سن کر آپ سے سیکھنا چاہئے ۔"

تان سین ۔" اس یگ میں تمہارے جیسے قدردان سے مل کر حیرت ہوتی ہے ۔ کیا تم واقعی
سمجھتے ہو کہ ایسے گانے ہی فلموں میں ہونے چاہئیں ؟"

میوزک ڈائرکٹر ۔" اس کا جواب دینے سے پہلے میں بھی آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں ۔
آپ کے زمانے میں لوگ لیلیٰ مجنوں ۔ شیریں فرہاد ۔ اور طوطے مینا کی کہانیاں
پسند کرتے تھے ؟ یا قواعد اور گرامر کی کتابیں ؟"

تان سین ۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا ۔"

میوزک ڈائرکٹر ۔ مطلب یہ ہے کہ اچھا لٹریچر پیدا کرنے کے لئے گرامر جاننا ضروری ہے ۔
اور اچھے گانے بنانے کے لئے پکے راگوں کا گیان ہونا چاہئے لیکن عام لوگ
نہ گرامر سمجھ سکتے ہیں نہ پکے راگ ۔ اس لئے ضرورت ہے کہ آپ کے پکے راگوں
کو اس طرح پیش کیا جائے کہ ہر ایک ان سے لطف اٹھا سکے ۔"

تان سین ۔" کیا آجکل کے زمانہ میں بھی یہ ممکن ہے ؟"

میوزک ڈائرکٹر ۔" کیوں نہیں ؟ ابھی لتا کا گانا ریکارڈ ہوا ہے ۔ آپ نے جو راگ گایا تھا

لسے لتا کی زبانی سنئے۔"

(ساؤنڈ ریکارڈسٹ لتا کا ریکارڈ چڑھاتا ہے)

تان سین۔ بہت شاباش۔ شاباش، اس لڑکی نے تو کمال کر دیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ عورتیں بھی اتنا ریاض کر سکتی ہیں۔"

میوزک ڈائرکٹر "لتا اس وقت ہندوستان کی بہترین گانے والی ہے۔ لیکن اس نے بھی جو کچھ سیکھا ہے وہ آپ جیسے سنگیت کاروں سے ہی سیکھا ہے"

تان سین۔ "اب میں بے فکر ہو کر جنت کو واپس جا سکتا ہوں"

میوزک ڈائرکٹر "نہیں نہیں۔ ابھی نہیں جا سکتے۔ ابھی آپ نے ایک گانا ریکارڈ کرایا ہے اس لئے آپ باقاعدہ میوزک ڈائرکٹر ہو گئے ہیں۔ میں آپ کو کل میوزک ڈائرکٹرز ایسوسی ایشن کی میٹنگ میں آنے میں دعوت دیتا ہوں۔"

تان سین۔ کل تک تو میں نہیں ٹھہر سکتا۔ جنت کے فرشتوں سے میں صرف ایک دن کی اجازت لے کر آیا ہوں"

میوزک ڈائرکٹر۔ "تو جاتے ہوئے ہماری برادری کے لئے کوئی پیغام تو دیئے جائیے ہمیں آپ سے بہت کچھ سیکھنا ہے، اور شاید آپ نے بھی ہم سے کچھ سیکھا ہو"

تان سین :۔ "بے شک بے شک یہ تو میں نے آپ لوگوں سے ہی سیکھا ہے۔ کہ سنگیت کو محلوں میں قید رکھنے کی بجائے عام لوگوں میں تقسیم کر دینا چاہیے کوئی شک نہیں کہ اپنی فلموں کے ذریعہ آپ لوگوں نے ہندوستانی جنتا کو سنگیت سے مالا مال کر دیا۔ لیکن اگر آپ برا نہ مانیں تو کہوں خیال رکھئے کہ نقلی ہیرے اور کھوٹے سکے نہ چلنے لگیں نئے ڈھنگ لائیے۔ مگر اور کسی کی نہیں تو میری خاطر

ذرا سُر اور تال کا خیال بھی رکھئے۔ بس اب مجھے واپس جانا ہے۔.........

.....سنگیت زندہ باد!"

(دفعتہً اندھیرا ہو جاتا ہے روشنی ہوتی ہے تو تان سین غائب ہیں)

سب:- "ارے تان سین جی چلے گئے——"

میوزک ڈائرکٹر:- "نہیں نہیں تان سین ہم سے کبھی جُدا نہیں ہو سکتے وہ تو ہماری سنگیت کی امر آتما ہیں!"

(پردہ گرتا ہے)

"میں نے فلمی گیت لکھے"

احمد ندیم قاسمی

میں نے فلمی گیت لکھے

بمبئی کی ایک فلم کمپنی نے مجھے ملتان سے دہلی بلایا۔ مجھے ایک فلم کے ایک درجن گیت لکھنا تھے۔ کمپنی کا ایک حصہ دار دہلی میں مقیم تھا۔ اس لئے میوزک کے بجائے مجھے اس پروڈیوسر سے ہدایات لینا تھیں۔ پچیس برس کا یہ نوجوان پروڈیوسر جب نئی دہلی کے ایک سینما ہال کی چوتھی منزل پر میرے پاس آیا تو جی چاہا اس سے مصافحہ کرنے سے پہلے لپک کر لفٹ کو تھپکا آؤں۔ جس نے بغیر مبالغہ ۶ من گوشت کو اس آسانی سے چوتھی منزل تک پہونچا دیا۔ لیکن پروڈیوسر دروازے میں حائل تھا۔ اور ایک چیونٹی کے لئے بھی ناممکن تھا کہ وہ باہر جانے کا کوئی راستہ تلاش کر سکے۔ اگر پروڈیوسر کی ناک بے حد سرخ نہ ہوتی تو میں اسی دھوکے میں رہتا کہ ابھی وہ میری طرف پیٹھ کئے گیلری میں کسی کی راہ دیکھ رہا ہے۔ اس پر غضب یہ کہ اس نے سیاہ رنگ کی شیروانی پہن رکھی تھی اور شیروانی کے بٹن بھی سیاہ رنگ کے تھے۔ ”مسٹر نادم! ہم کو تم لوگ سے مل کر بڑا خوش ہوا“۔ اس نے ایک مگدر اٹھایا

یہ اس کا بازو تھا اور جب میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے ہتھیلی پر حلوہ باندھ رکھا ہے، نرم اور گرم!

وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور جب تک میں دہلی میں رہا۔ اس صوفے کو سینڈو کے نام سے یاد کرتا رہا۔ اتنی مستقل مزاجی سے اتنے بڑے بوجھ کو پامردی سے سنبھالنا معمولی صوفوں کا کام نہیں، پروڈیوسر نے میرے آرام و آسائش کے سلسلہ میں ایک تقریر کی اور پھر مجھے گیتوں کی Situation بتانے لگا، "چندر کانت بدماش لوگ ہے۔ اس لئے گیت میں بدماشی کا بات ہونا چاہیئے، اگر تم نے کبھی بدماشی کیا ہے تو تم لوگ کو یہ بات مالم ہوگا چندر کانت آوٹ ہے۔ اس لئے ہم اور بھی بدماشی کا بات مانگتا ہے۔ آنکھ اور ہونٹ اور بال کا گیت بہت سُنا ہے ہمارا کمپنی فلم ڈم میں ایک ریوولیوشن کرے گا۔ تم لوگ جوبن کا گیت لکھو۔ ہم ادھر گیت گوائے گا۔ ادھر جوبن کا کلوزاپ لائے گا۔ چار آنے والا آڈینس بھی مانگتا۔"

اس فن کے مرمریں مینارے نیچے گھسیٹا جا رہا تھا اور اپنی قسمت پر دل ہی دل میں آٹھ آٹھ آنسو رو رہا تھا۔ جو مجھے محض چند سو روپوں کے لئے اس دنیا میں لے آئی تھی۔ پروڈیوسر نے پہلو بدل کر سنہری سگریٹ کیس نکالا اور صوفے کا ایک اسپرنگ رو دیا۔ وہ مجھے دوسری "سچوایشن" بتانے لگا۔

"ہیرو کو شک ہو جاتا ہے۔ ہیروئن روتا ہے اور بھگوان کرشن کی مورتی کے سامنے شکتی کی پرارتھنا کرتا ہے۔ یہ گیت اس مابھک ہو کہ سننے والے کا آنسو نہ رکے "آنسو نکال فلم" باکس آفس ہٹ ہوتا ہے۔ اگر تم لوگ نے ہمارا آنسو نکال لیا۔ تو ہم سمجھے گا تم نے ساری دنیا کا آنسو نکال لیا۔ اس گیت کا سچوایشن

ہم نے پیدا کیا، کہانی والا مرہٹہ بکتا تھا یہ فولش ہے، پر یہ کہانی اور گیت لکھنے والا اکثر ایسا بکتا ہے.... سگریٹ پیئے گا؟"

اس وقت سگریٹ پینے کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔ میں سگریٹ پھونکنے لگا اور وہ مجھے تیسری سچوایشن بتانے لگا۔"یہ سچوایشن اتنا بڑا ہے کہ شانتا رام اور دیوکی بوس بھی دیکھے گا تو غیرت کھا کر ڈائرکشن چھوڑ کر بیراگی بن جائے گا۔ یہ سچوایشن ہمارا وائف نے ایک انگلش فلم سے نکالا ہے۔ وہ ایسا ہے کہ ہیروئن کا رومال گرتا ہے ہیرو اٹھاتا ہے اور ہیروئن کو بلاتا ہے۔ ہیروئن نہیں بولتا ہے۔ ہیرو گا کر بلاتا ہے ہیروئن گا کر جواب دیتا ہے۔ اس ڈوئٹ میں پہلے گُسّہ ہوگا، پھر خوشامد—پھر لَو ہوگا۔ اور جب لَو کا بول آئے گا۔ تو ہم ایک بھونرے کو ایک پھول پر بیٹھا دکھائے گا سمجھا؟"

"سمجھ گیا" میں نے سگریٹ ختم کر لیا تھا۔

باقی نو سچوایشن بھی کچھ ایسی ہی تھیں۔ میں نے تمام نوٹ لے لئے اور جب پروڈیوسر نے دوسرے روز میرے مزاج پوچھے تو میں نے اُسے اطلاع دی کہ میں نے بارہ کے بارہ گیت لکھ لئے ہیں! فون کے پرلے سرے پر خاموشی چھا گئی۔ کچھ وقفہ کے بعد ریسیور رکھ دیا گیا۔ میں دیر تک حیران بیٹھا رہا اور جب تھک کر گیلری میں قدم رکھا تو لفٹ پر وڈیوسر کو لئے ہوئے میرے سامنے آکر رُکا:"ہیلو مسٹر نادم" پروڈیوسر نے دونوں، نگدر اٹھا کر مجھ پر چڑھائی کر دی۔" تم لوگ نے اگر وَن ڈزن یعنی ایک دم ایک درجن گیت ایک رات میں لکھ لیا ہے تو دس اِزا اے میرکل! ہمارا ابا بے والا منشی لوگ تو وہ وہ غمزدہ کرتا ہے۔ جیسے گیت نہیں لکھ رہا ہے"! وہ زور سے ہنسا۔ اگرچہ یہ ہنسی اس کے پیٹ ہی میں کودتی رہی۔

پروڈیوسر نے سب گیت نہایت توجہ سے سُنے ۔ صرف "آرزو" کی جگہ "آشا" اور "پربھو کی جگہ "بھگوان" باندھنے کا مشورہ دیا۔ اور رقص کے ایک گیت پر اعتراض کیا اور کہا۔ دیکھو ہمارا فلم کے ڈانس کے لئے اس ماچھک پاؤں اُٹھے گا"....... اور اس نے کمرے ہی میں رقص کرنا شروع کر دیا۔ اس رقص کے مدنظر میرا گیت یقیناً بے معنی اور بے تال تھا۔ سو میں نے اسے فوراً بامعنی اور باتال بنالیا اور پیش کر دیا۔ اس نے چیک میرے حوالہ کیا اور جب لفٹ کے ذریعے نیچے پہونچا یا تو اسے معلوم ہوا کہ جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کر دیا ہے۔ کہتے ہیں اس نے اسی وقت فلم بنانے کے خیال کو رَد کر دیا اور دروغ بر گردن راوی، سُنا ہے کہ اس نے مجھے گالی بھی دی کیونکہ اگر گیت سُننے سے پہلے اسے پرل ہاربر کے اس حادثے کا علم ہوتا تو وہ یقیناً اپنے چیک کو ضائع نہ کرتا۔

دوسری دفعہ مجھے ایک فلم کے دو گیت ملے۔ یہ لاہور کا واقعہ ہے، پروڈیوسر نے پیغام بھجوایا کہ تین چار لڑکیوں کا باپ دوسری شادی کر لیتا ہے اور لڑکیاں باپ کو غیرت دلانے کے لئے ایک ایسا گیت گاتی ہیں کہ وہ گیت کے ختم ہونے کے فوراً بعد نئی بیوی کو طلاق دیدیتا ہے۔ ایک گیت لکھنے کی بجائے مجھے ایک معجزہ دکھانے کی تلقین کی گئی تھی اور میں نے گیت لکھنے کی بجائے معجزہ ہی دکھایا۔ پرڈیوسر دیر تک یہ معجزہ گنگناتا رہا۔ اور پھر خوش ہو کر گیت کی موجودہ اجرت میں دس روپے کے اضافہ کا وعدہ کیا۔ دوسرے گیت میں ایک ایسی لڑکی کے جذبات بھرنا تھے جو محبت کرتی بھی ہے اور نہیں بھی کرتی۔ وہ ایک ایسے نوجوان کو منتخب کرتی ہے جو اس سے محبت کرتا ہے اور نہیں بھی کرتا۔ ایک شاعر

کے لئے یہ ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔ مگر "میں تجھ سے محبت کرتی ہوں، میں تجھ سے کیسے محبت کروں۔" کے بول نے میری ساری مشکلیں حل کر دیں۔ گیت صرف پسند ہی نہیں کیا گیا۔ بلکہ سر آنکھوں پر رکھا گیا۔ صرف میوزک ڈائرکٹر نے محبت کو محویت میں بدلنے کی اجازت چاہی۔ جو میں نے فوراً عنایت کر دی۔ کیونکہ مجھے کل چیک ملنے والا تھا۔ مگر اس شام کو پروڈیوسر نے بدقسمتی سے ایک امریکی فلم دیکھ لی اور جب وہ گھر واپس آیا تو فیصلہ کیا کہ وہ اپنی کہانی کو اس امریکی فلم کے قالب میں ڈھالے گا۔ میرے گیت بھی اس انقلاب کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اور ان کی سچوایشنیں غائب ہو گئیں۔

تیسری بار میں نے ایک فلم کے گیت یوں لکھے کہ اپنے سب گیت پروڈیوسر کو پیش کر دیئے۔ اور پروڈیوسر نے ان میں سے اپنے کام کے گیت چن لئے مجھے نہ کہانی کا علم ہوا اور نہ سچوایشنوں کا۔ ان گیتوں کی نقد اجرت ایک ہزار تھی اور بصورت چیک دو ہزار میں "نو نقد نہ تیرا ادھار" کی مشہور ضرب المثل بھول گیا اور چیک کو ترجیح دی۔ مگر بعد میں اطلاع ملی کہ کمپنی دیوالیہ نکال کر میکلوڈ روڈ پر پڑی دن کو تانگے اور رات کو تارے گن رہی ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ کیا سب فلم کمپنیاں اسی انداز میں گیت لکھواتی ہیں اور اگرچہ گیت لکھنے والے کا پلاٹ کے اس عروج میں کوئی قصور نہیں کہ ہیروئن سوتے ہوئے والدین کے قریب سے کھسک کر باہر آتی ہے اور برآمدے ہی میں پورے زور سے ایک گیت گانے لگتی ہے۔ مگر گیت کہنے والا یہ ضرور سوچتا ہے کہ یہ گیت سن کر تماشہ دیکھنے والے اسے جو گالیاں دیں گے ان کا حقدار صرف وہ ہے یا

افسانہ نگار اور منظر نگار اور پروڈیوسر اور ڈائرکٹر وغیرہ وغیرہ بھی ان کے حصہ دار ہیں

ایک زمانہ میں ہندی کے چند الفاظ کی ایک خاص ترتیب نئے سے نئے گیت ڈھال سکتی تھی۔ بن مندر اور پپیہا اور پریم اور سنسار وغیرہ ان گیتوں میں بار بار آتے تھے۔ پھر چاند ایسے محبوب کو زخم جگر کے ستاروں میں سما جانے کی دعوتوں کا دور چلا۔ آج ایسی ایسی غزلوں کا زمانہ آیا ہے کہ ردیف قافیہ کی تمام قیدیں ملیں گی۔ مگر ان میں کوئی روح نظر آ جائے تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔

موسیقی مشرق کی جان ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ فلمیں گیتوں سے محروم ہو جائیں مگر جن گیتوں کا رواج چل نکلا ہے۔ وہ اگر اسی طرح لکھے اور گائے جاتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب موسیقی تنگ آ کر سنکھیا پھانک لے گی۔ اور شاعری گاڑی کے سامنے لیٹ جائے گی۔

اب میرا ارادہ ہے کہ صرف ایسی فلموں کے گیت لکھوں گا۔ جن میں سچوایشن قطعی نہیں ہوں گی۔ بیٹھے بیٹھے یونہی کسی کردار کے دل میں اُمنگ اٹھے گی اور وہ گانے لگے گا۔ اور پھر اگر سچوایشن ضروری رہے گی تو پروڈیوسروں کو مژدہ ہو کہ میں نے تین سچوایشنوں پر بڑے دھڑلے کے گیت تیار کر رکھے ہیں۔ ضرورت مند بغیر کسی معاوضہ کے جب چاہیں حاصل کر سکتے ہیں۔

اب ہیرو مر رہا ہے، ہیروئن رو رہی ہے کہ اچانک ہیروئن مرنے لگتی ہے اور ہیرو — اٹھ کر رونے لگتا ہے اور گاتا ہے "آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ" ابھی وہ گا ہی رہا ہوتا ہے کہ روشندان سے موت کا فرشتہ نیچے اترتا ہے اور ہیرو کے ساتھ مل کر گانے لگتا ہے۔ اب ہیرو مارے خوف کے مرنے لگتا ہے اور

ہیروئن اٹھ کر رونے لگتی ہے اور فرشتہ سے مل کر گانے لگتی ہے اور جب گیت ختم ہوتا ہے تو فرشتہ مر جاتا ہے۔

ہیروئن[2] ڈولی میں سوار جا رہی ہے۔ ایک بلبل ڈولی کے پردے پر اترتی ہے اور گانے لگتی ہے۔ بلبل اردو میں گائے گی "مجھ سے بھی گل چھوٹا گلی میرا بھی دل ٹوٹا۔" بلبل کو انسان کی طرح گاتا دیکھ کر کہار مارے خوف کے ڈولی پھینک کر بھاگ اٹھیں گے۔ براتی بھی فرار کی راہ لیں گے اور جب بلبل آخری بول گنگنائے گی تو ہیرو آئے گا اور ہیروئن کو اٹھائے جائے گا اور بلبل کو پنجرے میں بند کرلے گا۔

آخری گیت کو پھانسی گیت کہہ لیجئے۔ ہیرو اپنی ہیروئن کے ظالم اور وحشی شوہر نامدار کو قتل کر دیتا ہے اور ہیروئن کی گواہی کی وجہ سے پھانسی کی سزا پاتا ہے اور جب پھانسی کا پھندا اس کی گردن میں ڈالا جاتا ہے تو یہ گیت گانے لگتا ہے۔ تیرا باپ مرے ظالم تیرا باپ مرے اور یہ گیت گاتے گاتے خود مر جاتا ہے۔ پھانسی پر لٹک کر جب وہ تڑپتا ہے تو رسی میں سے بالکل طبلے کی سی آواز پیدا ہوتی ہے۔

اِن تینوں سچوایشنوں کے حقوق بحق ہر فلم کمپنی محفوظ ہیں۔

اے میرے پیارے

فکر تونسوی

اے میرے پیارے

بمبئی یکم جنوری

مسٹر زمانی!

تمہارا ساٹھواں محبت نامہ ملا۔ میں تمہارے انسٹھ خطوں کو شیرِ مادر سمجھ کر پی گئی۔ جس کے لئے معافی مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ماں کا دودھ ہر مٹی پر حلال ہوتا ہے۔

تم نے لکھا ہے کہ تم میری خاطر پہاڑ کاٹ کر لانے کے لئے تیار ہو۔ لیکن تم نے یہ نہیں لکھا اے میرے فرہاد! کہ جب تم پہاڑ کاٹ کر اپنے سر پر لاؤ گے تو اُسے رکھو گے کہاں۔ بمبئی کارپوریشن نے ابھی پہاڑوں کی درآمد کے لائسنس جاری نہیں کئے۔ اس لئے یہ عین ممکن ہے کہ بمبئی کی ٹریفک پولیس تمہارا چالان کرا دے اور تمہاری شیریں کو ضمانت داخل کرنی پڑے۔

اس لئے اے میرے جاہل فرہاد! یہ احمقانہ حرکت نہ کرنا اور

پہاڑ کاٹنے کے بجائے گھاس کاٹ کر لانا تاکہ تم اسے فروخت کرکے دس آنے فی گٹھری حاصل کر سکو اور ان سے ایک ٹکٹ خرید کر کسی سینما گھر میں میری فلم دیکھ سکو۔

تم نے اپنی جتنی تصویریں مجھے بھیجی تھیں میں نے انھیں فریم میں جڑنے کے لئے ایک فریم میکر سے معاہدہ کیا تھا اور تصویریں اس کے حوالے کر دی تھیں مگر افسوس کہ وہ فریم میکر بمبئی سے بھاگ گیا اور نیویارک چلا گیا۔ جہاں مردانہ حُسن کے عالمی کمپیٹیشن میں وہ تمام تصویروں کی نمائش کرے گا۔

سچ مانو پیارے! کہ فریم میکر نے یہ اچھا نہیں کیا۔ شاید غالب نے ایسوں کے لئے ہی لکھا تھا کہ ع

ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچھا کہیں جسے

تمہاری ــــــ یقیناً تمہاری

نگینہ

بمبئی ۲ر جنوری

میری آنکھوں کے تارے دلبر پرشاد! یہ تمہاری انتہائی غلط بیانی ہے کہ میں نے تمہارے کسی بھی خط کا جواب نہیں دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکخانہ میں تمہارا کوئی رقیب چھپا بیٹھا ہے تحقیق کرو اور ہو سکے تو خود ڈاکخانہ میں پوسٹ مین بننے کی درخواست دیدو۔

تمہارا یہ کارنامہ واقعی بین الاقوامی حیثیت کا حامل ہے کہ تم نے میرے

ہجر و فراق میں آسمان کے کل تارے گن ڈالے۔ اے پیارے! تم نے تاروں کو شمار کر کے سائنس کی بہت بڑی خدمت کی ہے تم نے یہ نہیں لکھا کہ ان تاروں کی تعداد کتنی ہے۔ کیا تارے گنتے وقت تم عینک بھی لگاتے رہے ہو، تفصیل سے لکھو اپنی عینک کا نمبر، کمپنی کا نام اور قیمت بھی لکھو۔

ادھر کئی دنوں سے میرے سر میں ہلکا ہلکا درد رہتا ہے۔ درد ہی درد ہے جو اوّل اوّل معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور پھر عاشق کے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ اگر یہ درد آپ کے سر پر بھی سوار ہو چکا ہو تو اسپرو کی ٹکیاں استعمال کیا کیجئے۔ میں بھی ٹکیاں استعمال کر رہی ہیں۔

تمہاری ۔۔۔۔ سر درد میں مبتلا نگینہ

بمبئی ۴ جنوری

اے میرے پریمی شری پرمانند جی! آج میرا خانساماں جب چائے بنا کر لایا تو پہلا گھونٹ پیتے ہی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس چائے کے دھوئیں میں کسی انسانی دل کا دھواں ملا ہوا ہے۔ خانساماں سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ آپ کے خطوط جلا کر اس نے یہ چائے بنائی ہے۔ خانساماں نے فخر سے سینہ تان کر کہا کہ مس صاحبہ خطوط کا ایندھن نہایت اچھی کوالٹی کا ہے۔ میں نے اس خانساماں کو جھاڑ بتائی تو مسکرا کر چلا گیا۔ تم اس خانساماں کی مسکراہٹ پر مت جانا پیارے! بھلا اس جاہل کو کیا پتہ کہ محبت میں دل کیسے جلائے جاتے ہیں۔

اور کہو! تمہاری صحت کیسی ہے؟ اپنی صحت کا خیال رکھا کرو۔ پیارے جب

تمہاری تصویر مجھے چائے کے کپ میں دکھائی دی۔ تو اسے دیکھ کر مجھے اُبکائی آگئی کیونکہ تمہاری ہڈیوں کا ڈھانچہ دیکھ کر کسی کی بھی طبیعت مالش کرنے لگے گی کاش کہ تم سرسوں کے تیل کی مالش سے اپنے بدن کو بنا سکتے۔

کیا تم بمبئی بھی آرہے ہو؟ آؤ میرے خدا

تمہاری۔ چائے نوش نگینہ

بمبئی ۱۱ جنوری۔ شری آوارہ جی!

جب بھی ڈاکیہ تمہارا خط لے کر آتا ہے۔ میں اس دن اسٹوڈیو جانے کا پروگرام ترک کر دیتی ہوں۔ تم سوچتے ہوگے کہ شاید میں ہوں گی۔ مگر نہیں اے میرے پیارے ایسا بالکل نہیں ہوتا۔ مت پوچھو تو اچھا ہے۔

بات یوں ہوتی ہے کہ میرا ڈرائیور بڑا نک چڑھا ہے جونہی تمہارا خط دیکھتا ہے ناک سے چھینک لگاتا ہے اور تم جانتے ہو کہ چھینک بدشگونی کی علامت ہے اور بدشگونی میں اسٹوڈیو جانا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔ اگر تم اسی طرح خطوط بھیجتے رہے۔ تو مجھے یا تو فلم لائن سے کنارہ کشی اختیار کرنی پڑے گی۔ یا پھر اپنے ڈرائیور کو تبدیل کرنا پڑے گا۔ آہ! کتنا اچھا ڈرائیور میرے ہاتھ سے نکل جائے گا لیکن اے راجپور آوارہ کے چربے! تم میرے ڈرائیور کی پروا نہ کرو۔ محبت میں بھلا ڈرائیور کی قربانی کیا حقیقت رکھتی ہے۔ تم بغیر سوچے سمجھے اپنے خطوط بھیجتے رہا کرو۔

تم نے لکھا ہے کہ بمبئی آرہے ہو، ضرور آؤ اور آکر میرے زخمی دل پر

بچا یار کھ دو، واپسی کا کرایہ اپنے ہمراہ لانا مت بھولنا۔ کیونکہ تم میری طبیعت سے آگاہ ہو، پیارے! کہ میں تمہارے لئے جان تو قربان کر سکتی ہوں مگر کرایہ کے پیسے دینا میرے بینک بیلنس میں گڑبڑ ڈال دے گا۔ امید ہے کہ تم اس صاف گوئی پر پھولے نہیں سماؤ گے۔

تمہاری آمد کی منتظر! نگینہ

بمبئی ۲۸ جنوری

میرے بھولے بھالے جانی

تمہارے ہر لفافے پر عین درمیان جو پان کا پتہ بنا ہوا ہوتا ہے، کاش اس پتے پر الائچی اور سپاری ڈال کر اسے چبا سکتی لیکن میں پھر سوچتی ہوں کیوں دو پیسے کے پان کی خاطر تمہارے کروڑوں روپے کے دل کی مٹی کو پلید کردوں اس لئے میں ہر لفافہ اپنی نوکرانی کے بچے کو کھیلنے کے لئے دے دیتی ہوں میری نوکرانی کافی حسین ہے، کیا تم اس سے عشق کرنا پسند کرو گے؟

تم میرے ساتھ کسی فلم میں بطور ہیرو کام کرنا پسند کرتے ہو، اپنی اپنی پسند ہے۔ اس لئے میں تمہیں منع بھی نہیں کر سکتی ورنہ میرا خیال تو یہ تھا کہ تم گرپیٹا نگار بو کے ساتھ بطور ہیرو پیش ہوتے تو دنیائے فلمسازی میں آرٹ کا ایک نیا دروازہ کھول دیتے۔ گذشتہ دس سال سے اس دروازہ پر تالا لگا ہوا ہے میرے پیارے علی بابا کھل سم سم کی چابی لے کر آؤ اور اسے کھول دو۔ تم نے مطالبہ کیا ہے کہ میں تمہیں اپنی بہترین تصویریں بھیج دوں، لیکن پیارے

محبت میں تکلف کیسا؟ تم کسی فلمی رسالے سے میری تصویر کیوں نہیں پھاڑ لیتے میرا خیال ہے کہ کئی ایک فلمی رسالوں کی پرنٹنگ تو بہت اچھی ہوتی ہے اس لفافے میں دو پیسے بھیج رہی ہوں میری طرف سے ان دو پیسوں کا پان کھا لینا۔ اس سے تمہارے مُنہ کی بدبو ختم ہو جائے گی۔

تمہاری ——— دل گرفتہ

نگینہ

بمبئی۔ یکم فروری ۱۔

میرے محبوب مسٹر شن شناکی!

تم نے میری تصویر کو سامنے رکھ کر جتنی نظمیں کہی ہیں وہ سب مجھے مل گئیں۔ اب میں حیران ہوں کہ انھیں کیا کروں۔

میں کوئی جاگیر دار تو ہوں نہیں کہ خزانہ کا منہ کھول دوں اور آرٹ و ادب کی قدر دانی کر سکوں۔ تم ہی بتاؤ۔

پیارے! کیا میں جاگیر دار ہوں۔ میں تو نگینہ ہوں، جاگیر دار تو منروا کمپنی میں کام کرتا ہے تم نے جو یہ شعر لکھا ہے کہ میں یعنی نگینہ ہزاروں سال اپنی بے نوائی پر روتی رہوں۔ اور اس کے بعد جو کہا ہے تو میرا خیال ہے کہ یہ شعر میں نے کہیں پڑھا ہوا ہے۔ لیکن تم نے اسے اپنا کر چار چاند لگا دیئے ہیں۔ سچ ہے ایک چاند کو چار چاند کرنا کسی بہت اچھے مداری کا کام ہے کیا تم گوگیا پاشا کے شاگرد تو نہیں رہے۔ میرے پیارے جادوگر شاعر!

تم نے اپنی نظموں کے ساتھ جو ایک درخواست بھیجی کہ میں کسی دن تمہارے ویران خانۂ دل میں اگر تمہیں جلوہ دکھا سکوں تو مجھے نہایت غم و رنج کے ساتھ یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ تمہاری درخواست ٹائپ کی ہوئی نہیں تھی اس لئے میرے پرائیویٹ سکریٹری نے اُسے غیر پارلیمنٹری قرار دیکر رد کر دیا۔ تم اس قدر غیر پارلیمنٹری طریقہ پر عشق کیوں کرتے ہو۔ پیارے! آخر زمانے کے ساتھ ساتھ تمہیں چلنا چاہئے۔

کل میں ایک بک اسٹال پر گئی اور اس سے پوچھا۔ مجھے مسٹر شن شناکی کا مجموعۂ کلام چاہئے' ایک بک اسٹال والے نے کہا کہ اس نام کے کسی شاعر کا نام ہم نے نہیں سنا' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پیارے تم خود سوچو کہ وہ شاعر ہی کیا۔ جس کا نام نہ ہو، کیا بکسٹال والے کا یہ مطلب تھا کہ تم ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے ؟ تم ایک بار پیدا ہو کر دکھا دو جانی! تاکہ میں اُس بک اسٹال والے کو شرمندہ کر سکوں،

تمہاری —— شرمندہ
نگینہ

بمبئی ۷ فروری

تمہارے خط ملتے رہے اور میں دم سادھے رہی، تمہارے تار ملے میں خاموش رہی۔ تمہارے ٹیلیفون آئے میں نے حرکت تک نہ کی۔ لیکن آخر صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ صبر کا بھی آخر کوئی میٹھا پھل ہوتا ہے۔ چنانچہ

آج کی ڈاک سے میں تمہیں ایک میٹھا پھل یعنی گاجریں بھیج رہی ہوں۔ کسی دکاندار سے ایک آنہ کا گڑ لینا اور گاجروں کے ساتھ کھانا۔ پھر دیکھنا کہ تمہیں اتنا مزہ آئے گا۔ جیسے کسی ایکٹریس کے ساتھ عشق کے متعلق سوچنے میں آتا ہے۔

مجھے نہایت افسوس ہے کہ میں تمہیں اپنے گھر پر نہیں بلا سکتی تم کہو گے کہ اس کی وجہ؟ کاش میں وجہ بتا سکتی پیارے! عشق اور حسن کے معاملات میں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بتائی نہیں جاتیں۔ سمجھی جاتی ہیں۔ بڑی مشکل سے گلستاں میں ایک اشن شناکی یعنی دیدہ ور پیدا ہوا ہے۔

اگر تمہاری سمجھ پر پتھر پڑے ہوں تو ان پتھروں کو پھینک دو پیارے اب پتھر اور دھات کا زمانہ تھوڑا ہے، اب تو کانچ اور سلولائیڈ کا دور ہے مسٹر موزمدار۔

تم نے میری خاطر بمبئی کی سڑکوں پر ٹھوکریں کھائیں چیتھڑے پہنے، چنے چبائے، بڑیاں پئیں اور اب سمندر میں کودنے کا ارادہ بھی رکھتے ہو تمہارے ان مرحلہ در مرحلہ اقدامات کی تعریف مجھ ہیچ مداں سے کہاں ممکن ہے تم نے عاشقوں کی روایات کی لاج رکھی۔ اس گئے گزرے زمانہ میں تمہارا دم غنیمت ہے پیارے! تم سمندر میں کب تک خودکشی کا ارادہ رکھتے ہو خودکشی کرنے سے پہلے میرے نام ایک خط ضرور چھوڑ جانا۔ آخر کوئی نشانی تو دے جانا۔ ورنہ میں اپنے غمزدہ دل کی تشفی کیونکر کروں گی۔

تمہاری نگینہ

بمبئی ۱۲ر فروری۔

پیاری جمیلہ بیگم۔

افسوس ہے کہ تمہارے خطوط سنبھال کر نہیں رکھ سکتی۔ تمہارا یہ آخری خط بھی اپنے بھنگی کے نوجوان چھوکرے شمبھو کے ہاتھ سے میں نے چھینا۔ وہ تمہارے لفافے میں سے تمہاری تصویر کو لے کر چاٹ رہا تھا، کُتا کہیں کا۔

تم بغیر کسی جھجک کے بمبئی آجاؤ۔ یہاں کے سٹوڈیو تمہارے حُسن جہاں سوز میں جلنے کے لئے بیقرار ہیں۔ یہاں کی فلم کمپنیاں تمہارے بغیر سونی پڑی ہیں یہاں کے ہیرو تمہاری راہ تکتے ہیں۔ بوڑھے ہو رہے ہیں تمہاری خاطر بمبئی کی فلم انڈسٹری میں ایک بحران آرہا ہے۔ بس اب تم آہی جاؤ۔

ایکسٹرا لڑکیوں کے ایک بھینگے دلال سے میں نے بات پختہ کر لی ہے جو تمہیں ایسی ایسی جگہوں پر لئے لئے پھرے گا۔ جہاں فرشتوں کو بھی پر مارنے کی مجال نہیں۔ انسان تو خیر وہاں ہوں گے ہی۔

جمیلہ جلدی آؤ۔ تمہارے حُسن جہاں سوز کے پروانے بننے کے لئے یہاں کے ہیرو تمہاری راہ تکتے ہیں۔ آنے سے پہلے ایک خاص دن مقرر کر لینا اور اپنے ماں باپ سے کہنا کہ وہ تمہارے لئے اس دن جی بھر کر رو دھو لیں۔ کیونکہ بیٹی کا معاملہ ہے۔ پرائے دھن پر زور تو دیا نہیں جا سکتا۔ پیاری جمیلہ ــــــ!

تمہاری نگینہ

اداکاری

شوکت تھانوی

اداکاری

صاحب یہ حال پہلے تو نہ تھا یعنی غور تو فرمایئے کہ اگر یہ صورتِ حال ہوتی تو زندگی کیسے کٹتی اور سچ پوچھئے تو اعتبار ہی پر دنیا قائم ہے۔ اگر کسی کا اعتبار ہی اٹھ جائے تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس دنیائے ناپائیدار میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے ناقابلِ اعتبار بندے بھی ہیں۔ مگر کوئی نہ کوئی تو ان کا بھی اعتبار کرتا ہی ہوگا۔ ان کی خوشی اور غم کو سمجھنے والے بھی آخر ہوتے ہی ہیں ورنہ ان کی بھی زندگی عذاب بن کر رہ جائے کہ وہ رو رہے ہیں اور دیکھنے والے بیٹھے جھوم رہے ہیں کہ سبحان اللہ کس قدر مکمل رونا روئے ہیں۔ آپ، معلوم ہوتا ہے کہ جیسے واقعی رونا روئے ہیں، حد یہ ہے کہ آنسو تک بہے، چہرہ سرخ ہوگیا اور رونے کی پوری کیفیت طاری کر کے دکھا دی۔ وہ خوشی کا اظہار کر رہے ہیں تو ہمنشیں داد دے رہے ہیں کہ بھئی کمال کر دیا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے واقعی مسرت اُبلی پڑتی ہے۔ وفورِ مسرت کی اصلی کیفیت پیدا کر کے دکھا دی۔ وہ کسی کو دوستی

کا یقین دلائے تو دوست نقشِ حیرت بن کر رہ جائے بھئی واقعہ یہ ہے کہ بالکل اسی طرح آج کل کے دوست دوستی کا دم بھرتے ہیں ہو بہو یہی کیفیت ہوتی ہے۔ جیسا نقشہ آپ نے کھینچا ہے۔ اب بتائیے کہ اگر کسی کی ہر بات کے متعلق اسی قسم کی باتیں کہی جائیں تو اس کا دماغ کتنے دن ٹھکانے رہ سکتا ہے۔

شامت میری یہ آگئی تھی کہ دوستوں کے کہنے سُننے میں آکر اور خود نہ سمجھ کر کہ چلو یہ بھی فن کی خدمت ہے "گلنار" نامی فلم میں کام کر ڈالا۔ کسی نے تعجب کیا تو کسی نے افسوس کوئی رویا تو نہیں مگر ہنسنے والوں کی اس دنیا میں کمی نہیں رہی۔ نام دھرنے والے اپنے فرض سے غافل نہ رہے بہر حال وہ تو جو کچھ ہونا تھا ہوا مگر اب جو کیفیت گذر رہی ہے اس کا کوئی علاج سمجھ میں نہیں آتا۔ متعدد احباب سے پوچھا جو موجودہ دَور کے نہایت تجربہ کار شوہر سمجھے جاتے ہیں۔ بہت سے عزیزوں سے مشورہ کیا جو شوہر ہیں یا کبھی رہ چکے ہیں بلکہ ایک ایسے بزرگ سے بھی صلاح لی جو اس وقت اپنی چار بیویوں کے مزاروں کے مجاور اور پانچویں کے تیماردار ہیں۔ مگر کسی نے کوئی ایسی ترکیب نہ بتائی کہ میری مشکل آسان ہو سکتی۔ مجبوراً میں اس تحریر کے ذریعے جملہ شوہرانِ ملک و ملت سے استدعا کر رہا ہوں کہ اگر کسی بھائی کی میری اس مصیبت کا حل سمجھ میں آسکے تو مجھکو ضرور مطلع کریں۔ انشاءاللہ زندگی بھر ان کے حق میں دعا کروں گا کہ ان پر اس قسم کا عذاب نازل نہ ہو جس میں قسمت نے مجھے مبتلا کر رکھا ہے۔

صاحب غلطی انسان ہی سے ہو جاتی ہے۔ کر بیٹھا ایک فلم میں اداکاری اور دوسری شدید غلطی جو مجھ احمق سے سرزد ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ مارے محبت

کے یہ فلم بیوی کو بھی دکھا دیا کہ دیکھ نیک بخت تو جس کی زوجہ کہلاتی ہے وہ اپنے وقت کا کتنا بڑا ماہر فن ہے۔ پہلی غلطی تو خدا معاف کرے اور دوسری غلطی دعا فرمائیے کہ خدا کی وہ بندی معاف کردے جو میری بیوی کہلاتی ہے۔ بہرحال ان دونوں غلطیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلم دیکھ کر تو آپ سب کی بھابی بہت خوش ہوئیں اور بار بار وفور مسرت سے یہی کہتی رہیں کہ سچ مچ آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔ پہلی مرتبہ فلم میں کام کیا ہے لیکن بہت منجھے ہوئے ایکٹر معلوم ہوتے ہیں انھوں نے یہ فلم اپنی سہیلیوں کو لے جا کر دکھایا اور اُن سے بھی داد دلوائی۔ مگر اس کے بعد گھر کی زندگی کا اسلوب کچھ ایسا بگڑا ہے کہ خدا دشمن کے گھر کا بھی اسلوب ایسا نہ بگاڑے۔

میں اختلاجِ قلب کا پرانا مریض ہوں۔ کبھی کبھی دورہ پڑ جایا کرتا ہے اور جب مجھ کو دورہ پڑتا ہے۔ میری وفاشعار بیوی کی حالت قابل رحم ہوجایا کرتی ہے۔ تیمارداری وہ بیچاری کرتی ہے اور نمازیں پڑھ پڑھ کر وہ دعا کرتی ہے دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھتی۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر میری نبض دیکھ رہی ہیں، ہاتھ پیر دیکھ رہی ہیں کہ ٹھنڈے تو نہیں ہوئے۔ میں نے کروٹ بدلی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں میں نے پانی مانگا اور وہ نہایت مفرح شربت لے کر دوڑیں۔ ایک سے ایک عمدہ مربّہ پھلوں کے عرق، مختصر یہ کہ دنیا کی ہر نعمت میرے لئے موجود مگر یہ قصہ گلنار سے پہلے کا ہے۔ گلنار کے بعد اختلاج کا جو دورہ پڑا وہ ذرا مختلف تھا۔ دورہ مختلف نہ تھا بلکہ تیمارداری

کا رنگ ہی بدل گیا تھا بالکل۔ چنانچہ ہوا یہ کہ مجھے جو دورہ شروع ہوا تو پہلے حسب عادت وہ سٹپٹائیں۔ اس کے بعد غور سے میری صورت دیکھ کر مسکرائیں اور پھر بڑی غمازی اور ادا کے ساتھ اٹھلا کر بولیں "بس رہنے دیجئے پریشان کرنے کو، مگر اللہ جانتا ہے ایسی نقل اُتاری ہے اختلاج کی کہ جیسے اللہ نہ کرے سچ مچ دَورہ پڑ گیا ہو"

میں نے اپنی اختلاجی کیفیت میں ان کو یقین دلانے کی کوشش جو کی تو وہ بڑے مشکوک انداز کے ساتھ بولیں "دیکھ لیجئے گا شربت پینے کے بعد آپ مجھ کو بیوقوف بنائیں گے، مگر میں سمجھ گئی ہوں کہ یہ ایکٹنگ ہو رہی ہے آپ یوں کہتے تو یوں بھی میں شربت پلا ہی دیتی۔"

اب وہ شربت بناتی جاتی ہیں اور منتظر ہیں کہ میں ایک دم ہنس دوں گا مگر جب ہنسی دیر تک نہ آئی تو عاجز آکر بولیں "بھئی میں مانتی ہوں کہ آپ بہت بڑے اداکار ہیں مگر اب ختم بھی کیجئے اپنی یہ اداکاری کیا سچ مچ پریشان کر دینے کا ارادہ ہے۔"

اختلاج کی شدت میں واقعی رو دینے کو جی چاہنے لگا کہ اب ہم ایسے ہو گئے کہ ہماری بیماری بھی ایکٹنگ ہے اگر مر جائیں تو یہ سمجھیں گی کہ مرنے کی ایکٹنگ کر رہے ہیں۔ اُدھر وہ شربت دے کر ہاتھ پیر اچھی طرح ٹٹول کر بولیں۔ "کمال کر دیا آپ نے تو، چوٹھے ہیں گئی ایسی نقالی کہ ہاتھ پیر بھی ٹھنڈے کر لئے لیجئے شربت پیجئے اور ختم کیجئے یہ ڈھونگ۔ بھئی اللہ میرا تو دم الجھنے لگا۔ واہ۔ ایسا بھی کیا مذاق۔"

مختصر یہ کہ بمشکل تمام ان کو یقین آسکا کہ یہ اداکاری نہیں بلکہ واقعی اختلاج

ہے۔ مگر یقین اس وقت آیا جب وہ اپنے طرزِ عمل سے دورے کو نہایت شدید بنا چکیں۔ مگر اس یقین میں شک کار فرما رہا۔ چنانچہ میں نے خود اپنے کانوں سے سُنا کہ وہ اپنی ہمشیرہ عزیزہ سے فرما رہی تھیں۔

"بھئی اب تو میں یہ کہتی ہوں کہ یہ دورہ ہے ضرور"

وہ صاحبزادی اور بھی سمجھ دار نکلیں "کبھی جو ہو یہ دورہ۔ اچھا آپ امجد بھائی اور معین بھائی کو بلوا بھیجئے کہ آکر رمی کھیلیں نہ ختم ہو جائے یہ دورہ تو نام بدل دیجئے گا میرا۔"

اور میری عقلمند بیوی نے واقعی میرے رمی کے دوستوں کو بلا کر میرے سر پر تعینات کر دیا کہ کھیلو ان سے رمی۔ یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ رمی میرے لئے ایک ایسا مشغلہ ہے کہ اگر واقعی ملک الموت بھی آجائے تو میں اُن سے اتنی مہلت ضرور مانگوں گا کہ ذرا ایں شو کر دوں اس کے بعد آپ کو اختیار ہے۔ کہ میری روح قبض کریں یا کسی اور کی روح مجھ سے قبض کرائیں مگر اختلاج کے دورے میں میرا یہ محبوب شغل بھی ترک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ امجد اور معین دونوں نے آکر مجھ کو دیکھا اور بیوی کو سمجھایا کہ اس حالت میں وہ کیسے کھیل سکتے ہیں مگر وہ یہی کہتی رہیں کہ "بھائی آپ کو نہیں معلوم ہیں تو اب بھی یہی کہتی ہوں کہ یہ سب ان کی ایکٹنگ ہے۔ بات یہ ہے کہ مجھ سے کل ہی بحث کر رہے تھے اور میں یہی کہہ رہی تھی کہ نقل خواہ کتنی ہی اصل کے مطابق ہو مگر پکڑی ضرور جاتی ہے کہ یہ نقل ہے اب یہ مجھ کو اس نقل کی اصلیت کا یقین دلا رہے ہیں۔ خدا کے لئے ان سے کہہ دیجئے کہ مجھ کو یقین آگیا ہے اب کرم کریں مجھ پر۔"

مگر جب ان دونوں نے بھی ان کو یقین دلایا کہ یہ ایکٹنگ نہیں ہے بلکہ واقعی اختلاج کا دورہ ہے اور پھر ان دوستوں کے اصرار پر ڈاکٹر نے بھی آکر یہی کہا تو بمشکل تمام ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ سکے اور وہ معمول کے مطابق پریشان ہو سکیں۔

خیر یہ تو اختلاج تھا جو تماشہ بن کر رہ گیا مگر یہاں تو قدم قدم پر یہی مصیبت ہے کہ اپنی کسی بات کا کیونکر یقین دلائیں۔ اپنی ہر پریشانی، ایکٹنگ ہے پریشانی کا ہر صدمہ اداکاری ہے صدمے کی۔ ہر کیفیت نقالی ہے اسی کیفیت کی۔ ایک دو باتیں ہوں تو عرض کی جائیں روز کا یہی قصہ ہے۔ ابھی کچھ دن ہوئے ان کی چچی جان کا انتقال ہوا۔ بڑی محبت کرتی تھیں وہ مجھ سے اور مجھ کو بھی واقعی وہ اتنی عزیز تھیں کہ ان کے مرنے کا تو میں ہرگز روادار نہ تھا۔ چنانچہ جب یہ اطلاع آئی تو بیوی پر تو جو کچھ گذری وہ گذری مگر میں واقعی بچوں کی طرح رو دیا۔ اب ملاحظہ ہو حادثہ کہ میرے اس رونے پر وہ بُرا مان گئیں کہ آپ کو تو اپنی اداکاری کے کمال دکھانے کے لئے اسی قسم کے موقعوں کی تلاش رہتی ہے۔ جب آپ کی ممانی کا انتقال ہوا تھا اس وقت سوجھی ہوتی یہ اداکاری تو میں بھی جانتی" انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اب میں ان کو کیسے سمجھاتا کہ جن ممانی کا وہ ذکر کر رہی ہیں ان سے مراسم ہی ایسے تھے کہ مر گئیں تو اچھا بھئی مر جاؤ تمہاری مرضی۔ نہ وہ ہماری خوشی سے زندہ تھیں نہ ہماری مرضی سے انتقال فرمایا۔ مگر یہ چچی بیچاری تو جان چھڑکتی تھیں معلوم یہ ہوتا تھا کہ جیسے اپنی ماں زندہ ہو گئیں۔ میری طرف سے خدا جانے مرحومہ نے کتنی لڑائیاں لڑیں۔ میرے لئے نہ جانے کتنے تحفے ہمیشہ لایا کرتی

تھیں۔ ایک مرتبہ میں بیمار ہوا تھا تو اللہ بخشے ادھ موئی ہو گئی تھیں تیمار داری کرتے کرتے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ سسرال میں اگر مجھے کوئی اپنا نظر آتا تو وہ یہی چچی تھیں۔ بھلا ان کا اور اُن ممانی کا کیا مقابلہ جن سے جائیداد کے سلسلہ میں مقدمہ بازی تک ہو چکی تھی۔ مگر یہ بھی میری قسمت کہ ان کے مرنے پر میرا رونا تک اداکاری سمجھا گیا اور بیوی صاحبہ نے مستقل طور پر گرہ باندھ لی۔ اب ان سے اس غلط فہمی کو جتنا دور کرنا چاہتا ہوں اتنی ہی وہ اداکاری کے فن میں میرے کمال کی قائل ہوتی جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخر میں بھی انسان ہوں مجھے بھی غصہ آگیا اور میں نے بھی کہہ دیا۔ "اچھا صاحب! اداکاری ہے تو اداکاری ہی سہی میری تو ہر بات آپ کو اداکاری نظر آتی ہے۔"

وہ غالباً خود اس موضوع کو چھیڑنا چاہتی تھیں۔ کہنے لگیں "بے شک آپ ہر بات میں ایکٹنگ کرتے ہیں۔ وہ تو کہئے میں بے وقوف ہوں کہ آپ نے ہمیشہ مجھ سے ایکٹنگ کی اور میں نے اس کو اصلیت سمجھا۔"

میں نے بھی آج فیصلہ کن بات کر لینا ہی مناسب سمجھ کر کہا۔ "مثلاً میں نے کیا کی ہمیشہ آپ سے ایکٹنگ۔"

کہنے لگیں "یہ نہ پوچھئے بلکہ یہ پوچھئے کہ کس بات میں ایکٹنگ نہیں کرتے۔ آپ ہر مہینے تنخواہ لاکر دیتے ہیں اور بڑے کمال کے ساتھ یقین دلاتے ہیں کہ بس یہی ہے تنخواہ اور اتنے ہی روپئے ملے ہیں۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں یقین کر لیتی ہوں۔ چپ ہو رہنا دوسری بات ہے مگر یقین۔ اُوں ہُنہ!"

میں جلبلا ہی تو گیا "تو کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ مجھ کو تنخواہ ملتی کچھ ہے

اور بتاتا کچھ ہوں. گویا میں غبن کر رہا ہوں"

بڑی متانت سے بولیں "اپنی کمائی ہے خود آپ کو اس میں سے رکھنے کا حق ہے مگر بیوقوف کیوں بنائیے"

میں نے کہا "کل آپ دفتر تک زحمت فرمائیے اور وہاں تمام کاغذات دیکھ کر اطمینان کر لیجئے اپنا۔"

بڑے اطمینان سے بولیں "تو مجھے ضرورت کیا ہے اطمینان کرنے کی۔"

میں نے کہا "ضرورت آپ کو الزام دھرنے کی ہے، ضرورت آپ کو چور بنانے کی ہے۔"

عجیب دلخراش ہنسی ہنسکر بولیں "تو اس میں چوری کا ہے کی۔ اپنی تنخواہ ہے اپنی کمائی ہے اپنی بھی کوئی چوری کرتا ہے۔ میں تو بس یہ کہتی ہوں کہ صاف صاف کہہ دیا کیجئے۔"

میرا جی چاہا کہ سر پیٹ لوں اپنا۔ "بھئی خدا کے لئے آپ کل دفتر چلئے۔ میں حلف اٹھا سکتا ہوں کہ میری اتنی ہی تنخواہ ہے جتنی آپ کو معلوم ہے۔"

کہنے لگیں "چلئے مان لیا میں نے۔ مگر ہر مہینے کیا واقعی اتنا ہی چندہ دیا جاتا ہے پارٹیوں کا جتنا آپ بتاتے ہیں۔ آج انکا تبادلہ ہو گیا رخصتی پارٹی ہے آج وہ آئے ہیں استقبالی پارٹی ہے۔ آج پکنک ہے آج اس فنڈ میں روپیہ دیا گیا ہے اور اس قدر سنجیدہ بنکر کہتے ہیں جیسے مجھے معلوم تو ہے نہیں کہ آپ جس وقت جو چاہیں بن سکتے ہیں۔"

غصے کے باوجود مجھے ہنسی آ گئی "میں کہتا ہوں نہیں — ہو کیا گیا ہے

مجھے آخر ضرورت کیا ہے یہ چھوٹے چھوٹے جھوٹ بولنے کی۔"

کہنے لگیں۔"آپ چھوٹے بڑے منجھلے ہر قسم کے جھوٹ بول سکتے ہیں۔ کوئی اس وقت دیکھے آپ کو جب آپ محبت کی ایکٹنگ فرماتے ہیں۔"

چلیئے چھٹی ہوئی "گویا ان سے زندگی بھر جو محبت کی ہے یہ بھی سب محبت کی ایکٹنگ ہی تھی اب آپ ہی بتائیے کہ اس قسم کے موقعوں پر انسان گریبان پھاڑ کر نکل نہ بھاگے تو کیا کرے۔ مگر میں نے بڑی پسپائیت کے انداز سے کہا۔" تو گویا میں نے آپ کو اس سلسلے میں بھی ہمیشہ دھوکہ دیا ہے۔ محبت نہیں کی ہے بلکہ بیوقوف بنایا ہے۔"

کہنے لگیں۔" ارے آپ سے خدا بچائے۔ میری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ آپ کی کونسی بات اصل ہے اور کونسی نقل۔"

میں نے ضبط سے کام لیا۔ اپنے غصّے کو پی گیا مگر اس حیرت انگیز ضبط کا وہی نتیجہ ہوا جو ایک قلب کے مریض کو بھگتنا پڑتا ہے یعنی اختلاج کا دورہ۔ اور جب اٹھا تو وہ پھر سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں کہ یہ اختلاج ہے یا اختلاج کی اداکاری۔

خدا کے لئے بتائیے کہ اس کا کیا علاج ہے؟

منکہ ایک فلمی شاعر ہوں

مجید لاہوری

منکہ ایک فلمی شاعر ہوں

(مجید لاہوری کی ایک "ٹیبل ٹاک")

فلمی دنیا میں کون ایسا "بد ذوق" ہے جو میرے نام سے واقف نہیں۔ بس جہاں رموک کا نام آیا، لوگوں نے فوراً تعریف کے پُل باندھنا شروع کر دیئے۔

"اجی صاحب! رموک کے کیا کہنے؟ اپنے وقت کا تان سین ہے تان سین!" جی ہاں! سہگل کا تو محض نام مشہور ہو گیا تھا، ورنہ کہاں رموک اور کہاں سہگل کجا راجہ بھوج کجا گنگا تیلی" اور پھر رموک شاعر بھی تو ہے۔ ایسے ویسے شاعروں کو تو وہ خاطر میں بھی نہیں لاتا"

ایک صاحب جو گانے والے شاعروں سے جلے ہوئے تھے کہنے لگے "جی ہاں! آجکل مشاعروں میں کیا رکھا ہی کیا ہے، بس ذرا آواز اچھی ہو۔ اہلِ مشاعرہ خود بخود جھومنے لگیں گے۔ اور اگر اتفاق سے آواز کے ساتھ شکل بھی ذرا ماشاءاللہ ہوئی تو بس پھر کیا کہنا بڑے بڑے استاد مقابلے سے نہ بھاگ نکلیں تو بات ہی کیا ہوئی کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

اب تو بزم شعر میں یوں داد دینا چاہیئے
"ہاں مری جاں پھر ذرا کہنا اسی آواز سے"

اتفاق سے میں بھی پاس سے گذر رہا تھا میں نے جو اس غریب کو یوں جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے دیکھا تو سوچا کہ بیچارے کی آواز اچھی نہیں ہو گی جب ہی یہ گانے والے شاعروں کے خلاف زہر اگل رہا ہے شروع شروع میں جب مجھے شاعری کا شوق ہوا تو میں نے بڑے بڑے شاعروں کے دیوان کھنگالنا شروع کر دیئے۔ اور اس کے ساتھ عروض کی طرف بھی کچھ توجہ دینا شروع کر دی اور اپنی غزلیں ایک استاد کو دکھانا شروع کر دیں آخر جب میں نے سمجھا کہ میں بھی اِس میدان کا "مرد" بن گیا ـــــ ہوں تو ایک مرتبہ میں نے نہایت محنت سے ایک غزل لکھی یوں سمجھئے کہ جگر کے ٹکڑے کاغذ پر بکھیر دیئے۔ اور غزل ایک علمی ادبی رسالہ "ماہتاب" میں چھپنے کے لئے بھیجدی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میری غزل بہت نمایاں جگہ پر جلی قلم سے شائع ہو گی لیکن میرے غصّہ کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے یہ دیکھا کہ اُس نامعقول ایڈیٹر نے میری غزل پر ناقابلِ اشاعت لکھ کر واپس کر دیا۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے پھر کبھی کسی علمی ادبی رسالہ میں ـــــ غزل بھیجنے کی حماقت نہیں کی۔ اب میں دن رات اس سوچ میں رہنے لگا کہ کس طرح شہرت اور دولت حاصل کی جائے چنانچہ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے یہ طے کیا کہ فلمی لائن اختیار کرنی چاہیئے۔ لیکن اس کے لئے شاعری سے زیادہ گلے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اب میرے سر میں یہ خبط سما گیا کہ کسی طرح پکّا راگ سیکھنا چاہیئے۔ ایک روز میں اس خیال میں مگن

باہر کھیتوں میں گھوم رہا تھا کہ سامنے رہٹ چلتا دیکھ کر پانی پینے وہیں چلا گیا۔ تھکا ہارا تو تھا ہی درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں وہیں ذرا استانے کے خیال سے لیٹ گیا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، اور رہٹ چلنے کی آواز متواتر کانوں میں آ رہی تھی۔ یکایک دماغ میں یہ خیال آیا کہ یہ پکے راگ کی کوئی راگنی معلوم ہوتی ہے خیال کیا آیا۔ یوں سمجھئے کہ گوتم کو درخت تلے نروان حاصل ہو گیا۔ یہ تو میں نے پہلے ہی سے سنا ہوا تھا کہ پکے راگ کا کنوئیں کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اسی لئے۔ راگ سیکھنے والے کنوئیں کے اندر منہ ڈال کر دات کو مشق کیا کرتے ہیں، چنانچہ میں نے بھی تہیہ کر لیا کہ رہٹ کی آواز کو استاد بنا کر راگ کا مہورت کر دوں۔

اس سلسلے میں ایک بات اور یاد آگئی پکے راگ کی نسبت بزرگوں سے بھی سنا ہے کہ اس کو ایک راجہ نے ایجاد کیا تھا۔ وہ اس طرح کہ چند آدمیوں کو ٹھنڈے پانی کے تالاب میں دھکیل دیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ بچارے سردی سے کپکپانے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد جو انہیں باہر نکالا تو بچاروں کے دانت بج رہے تھے۔ بس اس کٹ کٹ کی آواز سے راجہ نے پکا راگ ایجاد کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک مہاراجہ پکے راگ کی سرپرستی کرتے آئے ہیں۔ وہ بچارے سردی کے مارے سی سی، ساسا، لے لے، کر رہے تھے۔ اور مہاراجہ صاحب نے انہی آوازوں کو لے کر پکے راگ کی الف۔ ب۔ سا رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔ تیار کر لی انہی سات لفظوں کی بنیاد پر اپنی راگ راگنیاں تیار کیں کہ بقول شخصے علم موسیقی بھی علم دریا دہو کر رہ گیا۔

اسی دھن میں کنوئیں سے واپس لوٹا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ چند چرواہے گا یوں

کو لے کر جا رہے ہیں۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی، گائیں ہی گائیں نظر آتی تھیں۔ یہ دیکھ کر بے اختیار زبان سے نکل گیا۔ "سارا جہان گائے ہے!"

غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو اچھا خاصہ فلمی مصرع تیار ہو سکتا ہے۔ بس پھر کیا تھا، دماغ پر ذرا زور دینے کی دیر تھی، کہ پورا مصرع اس طرح تیار ہو گیا ؎

تیری میری کہانیاں سارا جہان گائے ہے

مصرع کیا تیار ہو گیا۔ یوں معلوم ہوا، جیسے قارون کا خزانہ ہاتھ آ گیا، میں ابھی سے اپنے آپ کو فلمی شاعر سمجھنے لگ گیا۔ اور فلمی شاعری میں ہوتا بھی کیا ہے۔ نہ وزن کی ضرورت، نہ بحر کا جھگڑا۔ نہ فاعلاتن کی گردان بس الٹے سیدھے الفاظ ملائے اور فلمی گیت تیار ہو گیا۔ باقی رہ گیا تال کا سوال۔ وہ گانے والے خود ٹھیک کر لیں گے بلکہ انہیں وزن کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ پہلے کہا کرتے تھے کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو ہوتا ہے۔ لیکن اب کہنا چاہئے کہ بگڑا شاعر اسٹوڈیو میں پہنچ جاتا ہے۔ فلمی شاعروں کیلئے یہی کافی ہے کہ چند جوان اور پھڑکتے ہوئے الفاظ لئے۔ انہیں اٹھتی جوانی کی امنگوں کا جامہ پہنایا، اور کسی چلبلی فلم اسٹار کے منہ سے کہلوا دیا۔ چلو چھٹی ہوئی۔ اب یہی مصرع دیکھئے ؎

تیری میری کہانیاں سارا جہان گائے ہے

اچھا خاصہ فلمی مصرع معلوم ہوتا ہے، فلم میں گایا جائے تو دل پھینک نوجوان پھڑک اٹھیں۔ حالانکہ معنوی لحاظ سے مصرع سراسر غلط ہے کہانیاں گائی نہیں جاتیں بلکہ سنائی جاتی ہیں۔ لیکن وہ فلمی شاعری ہی کیا جس کے کچھ معنی ہو سکیں گو یا معنی ہونا فلمی شاعری کی توہین ہے جسے کوئی فلمی شاعر برداشت نہیں کر سکتا۔

ایک مصرع تو تیار ہو گیا تھا۔ ذرا توجہ دی۔ اور آن کی آن میں ایک پھڑکتی ہوئی فلمی غزل تیار ہو گئی۔ بس یہ ہے میری فلمی شاعری کی ابتدا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سب فلمی گیت اسی طرح گھڑے جاتے ہیں۔ علمی ادبی شاعری تو نازل ہوتی ہے لیکن فلمی شاعری اس طرح بنائی جاتی ہے جس طرح چورن والا چورن بناتا ہے، اور کہتا ہے ؎

چورن بنا ہے میرا اعلیٰ
اس میں گرم مسالہ ڈالا

اس کے بعد تو اللہ دے اور بندہ لے، میں نے اس قدر فلمی گیت تیار کیے۔ کہ اچھے اچھے شاعروں کی شہرت میرے آگے ماند پڑ گئی دولت تو اب گویا میرے گھر کی باندی تھی۔

ایک اور فلمی گیت کی شانِ نزول ملاحظہ ہو :۔

ایک مرتبہ ایک نل میں سے پانی زور کے ساتھ تر، تر کرتا ہوا نکل رہا تھا آواز کانوں میں آتے ہی میری "زبان قلم ترجمان" سے ایک عدد چٹپٹا سا گیت ٹپک پڑا۔ غرض کہاں تک گنائے جاؤں میری تمام شاعری اسی قسم کے اتفاقات کی مرہونِ منت ہے۔ اور مجھ ہی پر کیا منحصر ہے تمام مشہور فلمی غزلوں کو کھنگال جائیے۔ کیا مجال جو کوئی غزل بھی بامعنی نکل آئے۔ اب یہی غزل دیکھئے ؎

تو کون سی بدلی میں مرے چاند ہے آجا
تارے ہیں مرے زخم جگر ان میں سما جا

اس شعر کا ذرا معنوی آپریشن کر کے دیکھئے کہ شعر کے زخم جگر سے کتنی پیپ

برآمد ہوئی ہے۔ کوئی اس بھلے مانس شاعر سے یہ پوچھے کہ چاند آج تک کبھی تاروں میں سمایا ہے۔ چاند کے آس پاس بھی کوئی تارا دکھائی نہیں دیتا۔ پھر چاند بھلا تاروں میں کس طرح سمائے گا۔ ہاں تارے چاند میں سما جائیں تو کوئی عجیب بات نہ ہوگی۔ اور پھر مزے کی بات یہ کہ عاشق اپنے محبوب سے کہہ رہا ہے کہ تو میرے زخم جگر میں سما جا۔ واہ کیا لطافت ہے محبوب ہے یا زخموں کے جراثیم کا نمائندہ جو زخموں کی پیپ میں سما جائے گا۔ محبوب کے رہنے کے لئے مقام بھی ایسا منتخب کیا جس کی طرف کوئی نفیس مزاج انسان دیکھنا بھی پسند نہ کرے۔ لیکن صاحب فلمی شاعری میں سب چلتا ہے۔ جیسا گاہک ویسا مال۔ فلمی شاعری ـــــ میں تو بس جو منہ میں آیا کہہ دیا مثلاً ؎

دنیا مری جواں ہے

اور دنیا جوان ہونے کا فلمی تقاضا یہ ہے کہ ؎

ایسے میں تو کہاں ہے

لیجئے فلمی غزل تیار ہو گئی۔ پوری غزل تین چار شعروں کی ہوتی ہی ہے لمبی غزل کی فلم میں گنجائش نہیں سچ پوچھئے تو فلمی شاعری ترقی پسند شاعری سے بھی آسان ہے۔ ترقی پسند شاعری میں کچھ تو مطمح نظر ہوتا ہے۔ یہاں تو ڈائرکٹر نے ہیرو اور ہیروئن کو جس پوزیشن میں کھڑا کر دیا اسی پر ایک عدد غزل بن گئی۔ پیار کی جیت کی وہ غزل "اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا"

اب ذرا آپ ہی انصاف سے فرمایئے کہ کبھی دل کے ہزاروں ٹکڑے ہو کر اس طرح جگہ جگہ گر سکتے ہیں۔ دل نہ ہوا گیہوں کا بیج ہو گیا۔ کہ جگہ جگہ اسے

چھڑکا اور بو دیا۔ اور چھ مہینے کے بعد دنوں کی اچھی خاصی فصل تیار ہو گئی شاعری کا آخر کوئی تک بھی تو ہو یہاں تو بس یہ حال ہے کہ ؎

حالانکہ بے سری ہے مگر چھنتی تو ہے
چکی بہت بری ہے مگر پیستی تو ہے

خدا کی شان ؛ یہی رموک جسے علمی ادبی دنیا میں کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ آج فلمی دنیا میں اس کا طوطی بول رہا ہے۔ بڑی بڑی خوبصورت ایکٹرسیں جن سے صرف ایک بات کرنے کی خاطر نوجوان ہزاروں روپیہ برباد کر دیتے ہیں۔ وہ میرے دروازے پر کار لے کر خود آتی ہیں۔ فلمی شاعری میں تو اب مجھے اتنی مشق ہو گئی ہے کہ کوئی جانور بولے میں فوراً اس کی آواز پر ایک ایسا چلبلا سا گیت بنا دیتا ہوں جسے بچے گلیوں تک میں گاتے پھرتے ہیں۔ اور لطف یہ کہ مجھے اِن پر کوئی زیادہ دماغ سوزی بھی نہیں کرنی پڑتی۔ مثال کے طور پر۔ فلم رتن کے اِس مشہور معروف گیت کو لیجئے۔ چھوٹے چھوٹے بچے تک اس سے جی بہلاتے پھرتے ہیں۔ لیکن غور کیا جائے تو اس میں سوائے "کوک شاستریت" کے اور کچھ بھی نہیں۔ گیت ملاحظہ ہو۔

اڑن کھٹولے پہ اڑ جاؤں تیرے ہاتھ نہ آؤں
دُور دور سے کروں اشارے اور تجھے ترساؤں
تیرے ہاتھ نہ آؤں

محبوبہ اپنے عاشق سے علی الاعلان کہہ رہی ہے کہ تم مجھے حاصل کرنے کی ہزار کوشش کر دیکھو میں ہرگز تمہارے ہاتھ نہ آؤں گی گو اس کھلم کھلا اظہار بیزاری

کے بعد کسی سچے عاشق کی غیرت ہرگز تقاضا نہیں کرتی۔ کہ وہ اس قسم کے ہرجائی معشوق کے پیچھے اپنی عمر ضائع کرے۔ لیکن خیر! محبوب چونکہ ہوتا ہی بے وفا ہے اس لئے یہاں تک تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اب ذرا آگے چلئے۔ محبوب کہتا ہے

دور دور سے کروں اشارے او تجھے ترساؤں

"ترساؤں" کے لفظ میں اتنی زیادہ جنسیت ہے کہ مشرقی تہذیب اُسے سُنکر سر پیٹ لیتی ہے۔ محبوب کہہ رہا ہے کہ میں دور دور سے تو تیری طرف اشارے کروں ــــ لیکن جب تو "حرف مطلب" زبان شوق پر لائے تو تجھے خوب ترساؤں، انا للہ۔ پہلے تو یہ کہا کہ میں کسی کے ساتھ ہوائی جہاز پر بیٹھ کر اڑ جاؤں یعنی کوئی مجھے اغوا کر کے لے جائے اور میں تیرے ہاتھ نہ آؤں۔ اور پھر اس کے بعد صاف صاف کہہ دیا کہ میں ہوائی جہاز میں کسی دوسرے کے پہلو میں بیٹھ کر تمہارے ساتھ اشارے بازی کروں۔ اور تو مجھے دوسرے کے پہلو میں دیکھ کر اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرے ــ اور میں تجھے دور سے انگوٹھا دِکھا کر خوب ترساؤں ــــ انصاف سے کہئے کہ کیا ایسا گیت کوئی شریف آدمی سن سکتا ہے لیکن گیت کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اسی گیت کی وجہ سے فلم نے کئی کھڑکی توڑ ہفتوں تک بے پناہ رش لیا ہے۔

اب بتائیے میرا اس میں کیا قصور، میں تو یہ جانتا ہوں کہ ہدایت کار کی مرضی کے مطابق کوئی چٹپٹا سا گیت تیار کیا، اور پیسے بٹور لئے میں کوئی تہذیب و شرافت کا ٹھیکیدار تو ہوں نہیں، کہ خواہ مخواہ اس قسم کا دردِ سر مول لے کر بھوکا مروں، میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ اسٹوڈیو میں ڈائرکٹر نے ہارمونیم پر کوئی

عجیب و غریب سی گت بجائی، اور مجھ سے کہہ دیا۔ کہ اس گیت پر کوئی گیت بنا دو۔ مثلاً اس نے باجے پر بجایا ۔ پیں پیں پہ پیں

اور میں نے ذرا سوچ کر کہہ دیا۔ جب تو نہیں،

لیجئے گیت تیار ہو گیا۔ یا ہیروئن کو ٹھے مٹکاتی ہوئی دامن جھٹک کر پاس سے نکل جائے اور میں اس پر فوراً کہہ دوں ۔

اکھیاں ملا کے۔ جیا برما کے چلے نہیں جانا

ہاں۔ چلے نہیں جانا

پابند شاعری کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے جس میں محبوب مرد ہوتا ہے۔ جب ہیرو کسی بات سے مجبور ہو کر، ہیروئن سے رخصت ہونے لگے تو میں اس پر پکار اٹھوں ۔

جانے کا نام نہ لو راجہ جی! دل بیٹھا جائے

— دیکھو جی دیکھو دکھی جی کرے نہ ہائے

— اکھیاں ملا کے۔۔۔۔۔۔

جاؤ گے جانے نہ دوں گی، میں رستہ روک لوں گی

سیاں کے پیاں پڑ جاؤں گی رو کے کہوں گی

اکھیاں ملا کے جیا برما کے۔۔۔

یعنی عورت اپنے محبوب سے کمال بے حیائی کے ساتھ کہہ رہی ہے اے میرے راجہ! میرے پاس سے ہرگز نہ جاؤ۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے اور وہ جب پھر بھی متوجہ نہیں ہوتا (کیا شانِ عاشقی ہے) تو وہ ملتجیانہ انداز سے پہلو پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہے کہ میرے دکھی دل سے آہ بھی نہیں نکلتی۔ لیکن ظالم!

تمہیں پھر بھی مجھ پر ترس نہیں آتا اور اگر تم اب بھی نہیں مانتے، تو ذرا جا کر تو دیکھو، میں تمہیں ہرگز نہیں جانے دوں گی تمہارا رستہ روک کر کھڑی ہو جاؤں گی۔ تمہارے جہاز کے نیچے تارپیڈو بچھا دوں گی۔ تمہارے پاؤں پڑ کر بھی تمہیں روکنے کی کوشش کرونگی اور تم سے رو کر کہوں گی کہ۔ مجھ سے آنکھیں ملا کر کہاں جا رہے ہو، کچھ تو خدا کا خوف کرو، اپنے اوپر نہیں تو میری جوانی پر ہی رحم کرو۔

یہ ہے وہ شاعری جس کی بے حیائی کا کسی کے پاس بھی کوئی جواب نہیں اس لئے جوں جوں مجھے زیادہ تجربہ ہوتا جاتا ہے میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ ایسے ایسے عریاں گیت بناؤں کہ کسی کو "معجون فلک سیر" اور "حب نشاط" کی ضرورت نہ پڑے اور خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس میں حیرت انگیز کامیابی ہو رہی ہے۔ آزاد قوموں کے بچوں کو جس قسم کی شاعری کی ضرورت ہوتی ہے؛ اس کا احساس ابھی پاکستان اور ہندوستان کے مدبروں کو مدت مدید تک نہیں ہوگا۔ اور ہو بھی کیسے؛ جبکہ ان میں سے اکثریت خود اسی شاعری کی سرپرست ہے۔ حکومت ہند تو اپنی زیر نگرانی پھر بھی اچھی فلمیں تیار کرا سکتی ہے۔ لیکن پاکستان تو اس معاملے میں بالکل بمبئی کے رحم و کرم پر ہے بمبئی میں جس قسم کی فلم تیار ہو۔ پاکستان کو مجبوراً وہی خریدنی پڑتی ہے اس لئے حکومت ہند نے مجھے خاص طور سے اس کام کے لئے مامور کیا ہے کہ میں ایسے ایسے فحش اور عریاں گیت تیار کروں۔ جن کو گا گا کر پاکستانی نوجوان اخلاقی لحاظ سے نہ گھر کے رہیں نہ گھاٹ کے چنانچہ اس کے صلے میں مجھے حکومت ہند کی طرف سے کافی روپیہ مل رہا ہے ہماری فلمیں تو پاکستانی نوجوان کے اخلاق خراب کرتی ہی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ۔ اس قسم کے فلمی گیتوں کے ریکارڈ بغیر کسی معاوضے

کے نادانستہ طور پر پاکستانی ریڈیو بھی نشر کر کے ان کے رہے سہے اخلاق کا جنازہ نکالتا رہتا ہے جن کو پردہ دار گھروں کے اندر شریف بہو بیٹیاں تک سنتی ہیں اور نادانستگی میں ان سے اثر پذیر ہوتی رہتی ہیں اس طرح ہمارے مقدس مشن میں حیرت انگیز سرعت سے کامیابی ہو رہی ہے۔

پاکستانی الگ رنگ کے رسیا تو شروع ہی سے ہیں، ان کی اس ذہنیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم ان میں خوب زہر پھیلا رہے ہیں۔ ہمارے ان فلمی گانوں پر پاکستان کے فلمی رسالوں میں خوب شاندار تبصرے ہوتے ہیں، اخبارات انکی تعریفیں کرتے ہیں، دوکاندار انہیں فروخت کرنے کے لئے ہر وقت بجاتے رہتے ہیں ہوٹلوں میں انکی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، اور نوجوان طبقہ محض یہ ریکارڈ سننے کے لئے گھنٹوں ہوٹلوں میں بیٹھا رہتا ہے جس سے ہوٹل والوں کی خوب چاندی ہوتی ہے، غرضکہ پورا پاکستان ہمارے اس ہمرنگِ زمین دام میں خوب اچھی طرح جکڑا ہوا ہے، اور پاکستان کی نئی نسل بالکل تباہ ہو رہی ہے، ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ فلمی شاعری بنائی جاتی ہے، ایک روز اسٹوڈیو میں بکری کا بچہ بندھا ہوا تھا اسے بھوک جو لگی تو لگا "میں میں" کرنے میں نے اس کی آواز کو سن کر فوراً فلمی گیت میں اس طرح تبدیل کر دیا۔

میں تم میں میں۔ میں تم میں میں
میں دیوانہ، تو دیوانی۔ دونوں پگلے پن کے پانی
آ سنسار اک اور بسائیں میں ہوں راجہ تم ہو رانی
میں دیوانہ ....

فرقت میں دن رات ہے لب پر ہائے جانی ہائے جانی
بچے بچے تک گاتے ہیں میرا افسانہ تیری کہانی
دونوں کے ملنے کے دن ہیں حسن تمہارا میری جوانی
میں دیوانہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں مم میں میں۔ میں مم میں میں

گیت کو ایک بار گایا دو بار گایا، ہا ہا ہا۔ ساری دنیا ے ”میں مم میں میں“ نہ پکار اٹھے تو تف ہے میری شاعری پر۔ شاباش بکری کے بچے! بس چند ہفتوں کی بات ہے پھر ساری دنیا تیری طرح ”میں میں“ پکارنے لگ جائے گی۔ یہ میرا شاعرانہ اور نفسیاتی کمال ہے۔ کہ میں بکری کے بچے کی ”میں“ مرغ کی ککڑوں کوں وغیرہ کو ایسا فلمی جامہ پہناؤں۔ کہ تمام دنیا اسی رنگ میں رنگ جائے۔ دنیا میں ”میں“ تو کبھی فنا ہوتی نہیں ”میں“ پر ہی کائنات کے تنوع کا انحصار ہے۔ بڑے بڑے فلسفی ”میں“ کے طفیل ہی مشہور ہوئے۔ دنیا سے ”میں“ جاتی رہے تو اس کی تمام دلکشی پر جھاڑو پھر جائے یہ بکری کا بچہ دراصل کائنات کی ”میں“ کا قدرتی نمائندہ ہے۔ اس لئے اس کی آواز کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانا چاہئے۔ تاکہ دنیا گیت کے ساتھ بکری کے بچے کی بھی پوجا کرے۔ اسے جھک کر نمسکار کرے اور ہندوستان کے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں میں ایک کا مزید اضافہ ہو جائے۔ یہ میرا زور قلم ہے ورنہ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ؟ اور ایک بکری کے بچے ہی پر کیا منحصر ہے گدھے کی ڈھینچوں ڈھینچوں ہی کو لیجئے اس پر ایک نہایت عمدہ فلمی گیت تیار ہو سکتا ہے۔ مثلاً، مصرع طرح یہ ہو گا۔ ؏

او۔ ایں۔ او۔ آں۔ آں۔ آں۔ او آں

اس پر یہ گرہ لگی پہلو کو میرے گرد دے تو گرم میرے جانی۔
مطلع تیار ہو گیا اب پوری غزل سنئے:۔

پہلو کو میرے گرد دے تو گرم مرے جانی
دل سے لگا کے رکھی میں نے تری نشانی
دل کو بنا لیا ہے۔ تو نے میرا نشانہ
او۔ ایں۔ آں۔ رو آں۔ رو آں۔ آں
کیوں دل پہ تو نے ماری۔ نینوں کی یہ کٹاری
اک بار مسکرا دے۔ جی جان تجھ پہ واری
لے اب تو سنیما چل کر کے کوئی بہانہ
او۔ ایں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اب یہی گیت کوئی فلمی تیتری جب پردۂ سیمیں پر تھرک تھرک کر سنا دے گی تو کون مائی کا لال ہے جو لوٹ پوٹ نہ ہو جائے۔ پاکستانی نوجوان جوڑے میں حوصلہ ہے کہ ہوٹل میں چائے پیتے وقت اس گیت کا ریکارڈ سنے اور سنیما جانے کو تیار نہ ہو جائے سچی بات تو یہ ہے کہ جب تک ہندستان خصوصاً پاکستان کے نوجوان سلامت ہیں۔ میری فلمی شاعری کی خوب قدر ہو گی ڈر ہے تو یہ کہ کہیں پاکستان میں اخلاقی فلمیں نہ تیار ہونے لگیں، لیکن مستقبل قریب میں اسکی کوئی امید نہیں، اس لئے میں دن رات اس کوشش میں ہوں کہ ہمارے فلم سٹوڈیو زیادہ سے زیادہ ایسی فلمیں تیار کر کے پاکستان بھیجیں جن میں اردو زبان کے گلے پر کند چھری پھیری گئی ہو، اور اخلاق کا جنازہ نکال کر اسے گہرے گڑھے میں دفن کر دیا گیا ہو۔

ایک اور مزے کا گیت سناؤں آپ کو۔ اس کی شان نزول یہ ہے۔ کہ ایک مرتبہ مرغ گگرطوں کوں کر رہا تھا میرے ذہن رسا نے فوراً اس آواز کو اخذ کر کے یوں حسب مطلب بنا لیا گگرڑوں کوں کوں۔ گگرڑوں کوں کوں۔ اب اس پر گیت ملاحظہ ہو!

دیوانہ گیا دامن سے لپٹ۔ کبھی اس کروٹ کبھی اُس کروٹ

میں کہتی رہی چل ہٹ چل ہٹ۔ ظالم نے اٹھا ہی دیا گھونگھٹ

ہائے مرا گھونگھٹ

اب یہی گیت فلم "کروٹ" کے ذریعے نوجوانوں کی زبان پر چڑھ گیا، جی تو چاہتا ہے کہ اس کی خوب تشریح کی جائے۔ لیکن اس کے لئے پنڈت کوکا کے قلم کی ضرورت ہے، یا کوئی فحش نگار اس پر آمادہ ہو جائے۔ اور بتائے کہ محبوب "چل ہٹ" زبان سے کہتا ہے، لیکن عاشق کا شیوہ یہ ہے کہ گھونگھٹ اٹھا اٹھا کر کبھی اس کروٹ کبھی اس کروٹ جھانکتا ہی رہے۔ لیکن مجھے اس سے کیا، بازار میں چونکہ مال ہی اسی قسم کا لگتا ہے۔ اس لئے میں اپنے پیٹ پر کیسے لات ماروں، آپ کو پسند نہیں آتا آپ ناک بھوں چڑھایئے لیکن بازار میں آپ کو پوچھتا ہی کون ہے، وہاں تو بارہ سالہ کی چاٹ والے گیت چاہئیں اخلاق جلائے بھاڑ میں، شائستگی جائے جہنم میں، اپنا کام چل رہا ہے آپ کی دعا ہے!

الھڑ دوشیزہ

عادل رشید

الھڑ دوشیزہ

فرمانے لگے کہ

"مارا امیج بھر گیا چھے۔"

بڑی متانت سے عرض کیا کہ

"دریں چہ شک ——— اس میں کیا شبہ ہے"

"ہوں ہوں ——— "وہ بڑے اچنبھے کے ساتھ بولے "تمہیں بات سو کر دچھو ماری سمجھ میں تو آؤتی تھی"

"ماری سمجھ میں بھی نتھی آؤتی" ہم نے یوں ہی خالی الذہن ہو کر عرض کیا۔ "بات ہی اتنی مشکل ہے کہ ———"

انھوں نے خاکسار کی بات اُچکی ——— "اپن سالا ایک کام کو ہاتھ میں لے لا ہے فنشن (ختم) کر کے ہی دم لے گا۔"

"فنشن تو ہونا ہی چاہئے" ہم نے بھی ہاں میں ہاں ملانے ہی میں خیریت سمجھی۔

فرمانے لگے" یہ سالی ہیروئن کا کچھ گڑبڑ گھٹالا جان پڑتا ہے۔"

"خیال تو اپنا بھی یہی ہے"

"پھر —— !" تشویش بھرے لہجے میں اپنی پیشانی پر مکّا مار کر صوفہ پر اوندھے ہو گئے۔

اور پھر جوابی کاروائی کے طور پر ہم نے بھی قلابازی کھانے ہی میں خیریت جانی۔ لہٰذا قالین پر بیٹھے ہی بیٹھے ہم نے بھی ایک لاجواب قسم کا پینترا بدلا۔ اور پھر اچک کر کھڑے ہو گئے ادھر وہ گڑبڑا کر یکبارگی صوفہ پر اچھل کر بولے "پکڑا پکڑا۔ پکڑا گیا —— ؟" اور پھر ہمیں بڑی زور زور سے پورے کمرے میں چکر لگاتے ہوئے دیکھ کر سر پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔

"سالی ہیروئن سنبھالے ہی نہیں سنبھلی" وہ پیشانی پر گویا زور زور سے چپت کرتے ہوئے بولے "سالی یہ ایج (عمر) کا کچھ کھرابی ہے۔"

"جی ہاں، جی ہاں، بیشک بیشک" ہم نے بڑے وثوق سے تائید کی "بہر حال بھی تو گئے ہیں اب آپ بوڑھے پچپن سے کم تو کیا ہوں گے آپ"

وہ ہماری اس گرفت پر جیسے کچھ جھینپ سے گئے اور پھر خفیف سا تبسم فرماتے ہوئے گویا ہوئے" یہ بات نہیں بھئی۔ تم سمجھا نہیں" ان کی گردن قدرے اکڑ گئی "ہم اپنی ایج کا بات نہیں کرتا —— وہ تو ہم سالا ہیروئن کا ایج کی چکر میں ہو ئیلا ہے۔"

"یعنی —— ؟" ہم نے تفصیل چاہی "ہیروئن کے اوور ایج ہونے کا مسئلہ ہے یا انڈر ایج ہونے کا؟ یہ آخر خطرہ کس بات کا ظاہر فرما رہے ہیں آپ ؟"

وہ ہمارے اس سوال پر خوب ہنسے۔ ہاہاہا اور پھر گویا خود ہی لوٹن کبوتر بننے کے بعد ہمیں اپنی دانست میں مرغ بسمل بنائے ہوئے خوب زور سے ہنسی روک کر بولے "ہم بھی سالے داؤ پیچ برتے ہے۔ ابے پھیچ کی اپن سالا پھکری کب کتا ہے۔"

"یعنی ــــ ؟" ہم حیرت سے منہ کھولے انہیں دیکھ رہے تھے۔

سمجھانے کے طور پر بولے "ادھر آؤ ــــ"

اور جب ہم نزدیک پہنچے تو بڑے راز دارانہ طریقہ پر اپنا منہ ہمارے کان کے قریب کرتے ہوئے بولے "یہ سالا Flash Back (فلش بیک) بعد کچھ ہیروئن کا گڑبڑ گھٹالا کر ڈالو ــــ"

"جی ــــ!" ہم گویا ان کے مشورہ پر عمل کرنے کی کوشش میں ہیروئن کے ساتھ اس گڑبڑ گھٹالے کی اونچ نیچ پر خوب اچھی طرح غور فرمانے لگے تھے کہ وہ یکبارگی بڑے زور سے چیخے۔

"مار دیا ــــ مار دیا ــــ اپن نے مار دیا سالی ہیروئن کو۔"

اور ہم محض حیرت سے آنکھیں نکالے اور منہ پھاڑے انہیں دیکھ رہے تھے وہ صوفے پر سے اچھل کر ہمیں بڑی زور سے لپٹاتے ہوئے دہاڑے "یار معاف کرنا تم سالا بدھو ہے بالکل"

"جی! کیا فرمایا آپ نے" ہم نے قدرے ترشی سے اپنی پیشانی پر دو چار خفیف قسم کی شکنیں ابھارتے ہوئے سوال کیا "آخر آپ کا مطلب کیا ہے"

"اوہ! ڈارلنگ۔" وہ زور سے تالی بجا کر ناچ گئے۔

"اپن سالا کے بھیجے میں ایک بڑا ونڈرفل آئیڈیا آیلا ہے" اور پھر اپنے

آپ کو صوفہ پر گراتے ہوئے گویا خود سے باتیں کرنے لگے۔ "اوہ! واٹ اے ونڈرفل آئیڈیا۔ بھگوان سالا نے اپنا میجک بھی عجب کا بنائیلا ہے۔"

"آخر بات کیا ہوئی ـــــ؟" اب ہم ان کی ان حرکتوں پر گویا زچ کھا چکے تھے "کیا ہے وہ ونڈرفل آئیڈیا۔ ذرا ہم بھی تو سنیں۔"

"آہاہاہا۔ واہ، وا، واہ۔" وہ صوفے پر چت لیٹے لیٹے کمرے کی چھت کو بغور دیکھتے ہوئے بولے "بس اب سالی کوئی اکر پھکر نہیں۔ اگر سالی پکچر سنیما ہاؤس سے اتر جائے تو اپن سالا ڈائرکشن چھوڑ کر حجام بن جائے گا" اور پھر یکبارگی پاگلوں کی طرح صوفہ پر سے اٹھتے ہوئے مسکرائے "اے مسٹر کیا نام ہے تمہارا یعنی یہ کہ مسٹر منسی"

اور ہم ان کی اس بکواس پر ناک بھوں چڑھانے ہی والے تھے کہ وہ ہیں، اچھے بھلے آدمی کو منشی بنائے دے رہے ہیں کہ وہ اپنا نچلا ہونٹ اپنے آدھے ٹوٹے دانت سے کاٹتے ہوئے آنکھیں پھاڑ کر بولے "انگریزی پھلم مدکیری" دیکھی تھی تم نے ـــــ؟"

"جی ہاں ـــــ" ہم نے بڑی متانت سے ان کی طرف دیکھا "یہ فلم ہم نے دوبارہ دیکھی ہے"

"تو نکالو کاپی ـــــ"

ہم نے سہم کر اور بڑی رقت آمیز نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کاپی کھولی "اپن سالا کی پکچر کی ہیروئن بوڑھی ہوگی۔"

"اور ہیرو ـــــ؟" ہم نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے سوال کیا۔

"یہی ہوگا سالا اکیس، بائیس برس کا"

" اور ہیروئن کی عمر ——؟"

"کیا بکتے ہو یار تم ——" وہ غصہ ہوگئے۔ "کہہ تو دیا کہ اس سالی کو بوڑھی رکھو۔ یہی کوئی چالیس پچاس سال کی"

"اور کیوں نہ ہم اس کی پیٹھ پر ایک یہ بڑا سا کوبڑ بھی نکال دیں" ہم نے گویا "ہنچ بیک" کی یاد دلائی انہیں۔

"بیشک، بیشک ——" وہ ہماری اس صلاح پر خوش ہوگئے۔

HunchBack میں لافٹن کبڑا تھا۔ اور اپنی پکچر میں سسری کہکشاں کبڑی بنے گی"

"مگر پھر تو شروع سے ساری کی ساری اسٹوری چینج کرنی پڑے گی"

"کیوں؟ ——" وہ استادانہ طریقہ پر مسکرائے۔

"یہ اسکرین ہے اماں جی کا دودھ نہیں ہے کہ ہر کوئی آسانی سے ہضم کرلے"

وہ اکڑ گئے "تم دیکھنا کہ ہم سالا اسٹوری کو کیسالاجواب ٹوئسٹ دے گا"

"مگر ——"

"شٹ اپ —— "وہ اپنے داہنے ہاتھ کے انگوٹھے کی پاس والی انگلی کو اپنے ہونٹ کے قریب لاتے ہوئے بولے "اگر سنیما ہال میں پبلک سالی اپنا منہ نہ پیٹ لے تو پھر ڈائرکٹر نہیں بھنگی کہہ دینا ہمیں"

"وہ تو ظاہر ہی ہو رہا ہے"

"کیا جاہر ہو رہا ہے"

"یہی کہ سنیما ہاؤس میں پبلک اپنا منہ پیٹ لے گی"

اور وہ ہمارے اس طنز کو تعریف کا شربت سمجھ کر پی گئے اور مسکرانے لگے "مانتے تو ہو پیارے" وہ اپنی پیٹھ آپ ٹھونک رہے تھے "ہے نہ اپن سالا استاد"

"جی ——"

"جی کیا ——" وہ یکبارگی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ یہ پروڈیوسر لوگ سالا سب کا سب گدھا ہے کیا جو ہمیں ایک پکچر کا ایک لاکھ دیتا ہے"

"بیٹھک صاحب" ہم بُری طرح اب اپنی جان سے عاجز آ چکے تھے"

"کیا بیٹھک، بیٹھک کرتا ہے۔" وہ کمرے میں چہل قدمی فرمانے لگے،

"سچ مچ پروڈیوسر گدھے ہیں —" باوجود روک تھام کے یہ جملہ غیر ارادی طور پر جو ہمارے منہ سے نکلا تو وہ سیخ پا ہو گئے۔

"تم جناور ہے کیا یار" وہ بڑبڑائے

"ہم بولا کہ پروڈیوسر لوگ گدھا نہیں ہے"

اور تم کہتا ہے کہ وہ لوگ گدھا ہے"

"جی ——"

"جی کیا ——" وہ گرجے۔

"نکالو اسکرپٹ"

اور جب ہم نے اسکرپٹ نکالا تو وہ پوری ایک مہینے کی ساری کی ساری محنت پر ایک موٹی سی سُرخ پنسل پھیرتے ہوئے بولے۔

"یہ سب بکواس ہے۔"

وہ مسکرائے۔

"اب اپن سالا کی اس پکچر کا ہیرو تن اولڈ دمن ہوگا۔ بوڑھا عورت"۔

"اور وہ کبڑی بھی ہوگی"۔

"شور، شور ——" وہ فخریہ بولے "کبڑا اور بوڑھا"

"پھر —— !"

"پھر کیا —— "انہوں نے پورے وثوق کے ساتھ کہا۔

"پکچر سالی گولڈن جبلی کرے گی ——"

اور ثبوت کے طور پر بولے۔

"ہم دھانسو ڈائرکٹر ہے۔ دھانسو دیکھنا کہ کیا سالا ادھم مچے گا اس پکچر پر"

اور جب کہ ہم سچ مچ بڑی حیرت سے ان کا منہ تک رہے تھے۔ وہ کچھ سوچ کر بولے

"اپن سالا گڑبڑ گھٹالا کرے گا۔ سارا انگلش پکچر ہے گڈمڈ کر کے گھیٹر دے گا اس پکچر میں"

"تو پھر اس پکچر کا نام بدل دیجئے"

"کیوں —— ؟" ان کی پیشانی پر بے شمار شکنیں پڑ گئیں۔

"اس لئے کہ پکچر کا نام "الھڑ دوشیزہ" کچھ جچے گا نہیں"

ہم نے بڑی سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

"اس پکچر کا نام رکھئے بڈھی گھوڑی لال لگام ——"

اور وہ ہمارے اس مشورہ کو قطعاً مذاق سمجھتے ہوئے ہمیں کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگے۔

"دیکھو مسٹر — ہم تمہارا پتہ ابھی کاٹ دے گا ہاں!"

وہ گرجے

"تم ہم سے مسخری کرتا ہے!"

انہوں نے فیصلہ سُنایا۔

"ہم خود لکھے گا۔ ڈائیلاگ بھی ڈائیلاگ۔ دھرا کیا ہے ڈائیلاگ سالے میں"۔

اور ہم نے سہم کر ڈائرکٹر صاحب کی طرف دیکھا اسلئے کہ وہ بھیرے دھانسو اگر خدا نہ کرے کہیں وہ ڈائیلاگ بھی لکھنے لگے تو سچ مچ ہمارا پتہ کٹ جائیگا اور پھر ہمارا کیا ہوگا ہمارے بچوں کا کیا ہوگا۔ اور بیوی غریب کا کیا بنے گا۔ لہذا یہ سب اونچ نیچ جو ہمارے سامنے آئی تو ہم نے دھانسو صاحب کو مشورہ دینے کا خیال یک قلم موقوف کر کے ان کی ہاں میں ہاں ملانے ہی میں اپنی خیریت سمجھی۔ اور پھر ہم نے بڑے وثوق کے ساتھ بانگ دھل یہ اعلان کر دیا کہ واقعی یہ اسٹوری کا نیا موڑ بے حد شاندار ہے اور یہ تصویر جس کا نام "الھڑ دوشیزہ" ہے۔ کم از کم ایک سال تک ضرور چلے گی یعنی یہ کہ پورے باون ہفتے۔ جس کے کہ نصف سلور جوبلی ہوتے ہیں۔ اور اگر بقیہ نصف بھی مل جائیں تو یہی سلور جوبلی گولڈن جوبلی بن جاتی ہے۔

دھانسو صاحب اپنی کہانی کے اس نئے موڑ پر ہشاش بشاش کھڑے مسکرا رہے تھے۔ اور ہم بسور رہے تھے۔ دھانسو کی کہانی کا یہ نیا موڑ اپنے گلے کی پھانسی بن جاتی ہے۔

ایکٹریس

ثریا شوکت

ایکٹریس

ہیروئن کا نام پڑھ کر غالباً آپ یہی سمجھے ہوں گے کہ یہ ہیروئن بھی اور ہیروئنوں کی طرح بلا کی حسین، سفید برف رنگ کالی سیاہ خوبصورت آنکھوں اور موتی کے سے دانتوں والی کوئی لڑکی ہوگی اور ہم اسے خوب سر پر چڑھائیں گے اسکے حسن کی تعریفوں کے پل باندھ کر پروپیگنڈے کی گاڑی اس پل پر سے گذار دینگے اور کچھ دیر بعد جب افسانہ ذرا جالو ہوگا اِدھر اُدھر سے ایک عدد ہیرو پکڑ کر عام لوگوں کی طرح دونوں کو ہیروئن کے خطاب دلوا دیں گے۔ آخر اس قصہ کا اختتام ہیرو صاحب کی خودکشی یا ہیروئن صاحبہ کی کسی اور کے ساتھ شادی پر ہوگا۔ ورنہ ان دونوں کی شادی ہاؤس آبادی کردا خود ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوں گے ایسی ایسی اونچ کی باتیں تو ہمیں آتی نہیں البتہ سیدھی طرح اس افسانہ کی ہیروئن کا تعارف آپ لوگوں سے کروائے دیتے ہیں۔ آپ کو سخت ــــ مایوسی ہوگی ہماری اس ہیروئن کو دیکھ کر ممکن ہے آپ اسے ہیروئن نہ بھی سمجھیں۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے ہیروئن آخر ہیروئن ہے

کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا لہذا تیار ہو جائیے۔ اس کا حسن ملاحظہ کیجئے۔ ذرا ٹھیریئے۔ اول تو کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ بھیڑ چال سے باز نہیں آتے لوگ، بجانے کس ہوس رکھا ہے کہ ہر افسانے کی ہیروئن خوبصورت ہی ہونی چاہئے۔ حالانکہ ہیروئن کے لئے اس قسم کی کوئی قید نہیں کوئی افسانہ اٹھا کر دیکھئے۔ مجال ہے جو کبھی کسی ہیروئن کو بے حد حسین۔ خوش مذاق باحیا باتمیز، والدین کی لاڈلی۔ ہیرو کی چہیتی غرضکہ ہمہ صفت موصوف بنا کر پیش نہ کیا جائے مثال کے طور پر ایک ننھا سا افسانہ ملاحظہ ہو۔ جب شعیب نے اسے پہلی بار دیکھا تو اسے محسوس ہوا گویا کسی نے اسکی کنپٹی پر تھری ناٹ تھری کی گولی مار دی ہو۔ گل نگار کا ملکوتی حسن اسے مسحور کئے دے رہا تھا۔ آج پہلی بار اسے اس قدر مکمل حسن دیکھنے کا اتفاق ہوا اس نے غور سے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی چلا گیا۔ (ذرا بھی پروا نہ کی کہ پولیس اسے پکڑ لے گی) وہ بھی اپنی جگہ بے قصور تھا۔ گل نگار تھی ہی ایسی قتالہ عالم جو اسے دیکھ لیتا بس شعیب کی طرح پہروں دیکھے جاتا وہ بیرسٹر صاحب کی اکلوتی بیٹی تھی (گویا ہیروئن کے لئے اکلوتا پن بھی ضروری ہے) ان کی آنکھوں کا تارا، دل کا سہارا۔ بڑھاپے کی لاٹھی مستقبل کا ہمسر جو کچھ تھی یہی تھی اس کے حسن ذہانت اور خوش مذاقی کے ہر چہار دانگ عالم میں چرچے تھے (اب ہیرو سے ملاقات ملاحظہ فرمائیے) ایک دن جبکہ دن کا شہنشاہ اپنی خونیں نگاہوں سے تمام کائنات کو گھورتا ہوا اپنے مسکن سے نکلا تو شکار کا دلدادہ شعیب بھی شکار کے شوق میں اپنی بوڑھی والدہ سے اجازت لے کر جنگل کی طرف ہو لیا جنگل میں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ تمام جانور آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے کسی اور جگہ تشریف لے گئے ہیں۔ اسے سخت مایوسی ہوئی قریب تھا کہ وہ دھاڑیں مار کر رونے لگے کہ ناگاہ اس کا گھوڑا خواہ مخواہ بدکنے لگا

اس نے اتر کر گھوڑے کو ٹھونک بجا کر دیکھا دیسے تو تمام گھوڑا ثابت تھا صرف پیاس کے مارے زبان باہر نکل آئی تھی شعیب نے فوراً تھرموس سے پانی نکال کر گھوڑے کو پیش کیا گھوڑا آخر گھوڑا تھا پانی پی کر بھی ہنہناتا رہا۔ شعیب نے یہ آتا۔ دیکھے تو فوراً گھوڑے کی لگام تھام پانی کی تلاش میں ایک سنسان سی سڑک کی راہ لی۔ کچھ دیر چلنے کے بعد اسے زرد رنگ کی ایک کوٹھی نظر پڑی۔ وہ جھجکتے جھجکتے اندر گیٹ میں داخل ہوا وہاں اس وقت کوئی متنفس نہ تھا شعیب نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی تو اسے ایک لڑکی گھاس پر بیٹھی مطالعہ کرتی ہوئی نظر پڑی۔ شعیب نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے کہا۔ ذرا سنئے اس لڑکی نے گھوم کر اس طرف دیکھا اور دریافت کرنے کے لئے کہ وہ کون ہے اور۔ کیا چاہتا ہے شعیب کی طرف بڑھی اس حسن پیکر کو دیکھتے ہی شعیب کو سکتہ سا ہو گیا۔ وہ اس کا گھوڑا ٹکٹکی باندھے گل نگار کو دیکھنے لگے سیمیں بدن گل نگار کا حسن پورے نکھار پر تھا۔ ہرن کی سی خوشنما آنکھیں۔ خنجر در کمان سے ابرو۔ تیز سی پلکیں ان تین ہتھیاروں کے علاوہ وہ مندرجہ ذیل چیزوں کی بھی مالک تھی۔ (۱) سرو قد، سڈول جسم، چیتیا کمر۔ گول مول سر (بے وقوفوں والا) صراحی دار گردن (گجرات کے برتن جیسی) خوشنما چھوٹے سائز کے کان یاقوتی ہونٹ موتی کے سے دانت (گویا لیڈیزون چوائس سے آرڈر دے کر بنوائے گئے ہوں) شعیب اس حسن مجسم کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس قدر مکمل حسن بھی اس دنیا میں ہو سکتا ہے۔ نہیں۔ ۔ ۔ نہیں ہرگز نہیں یہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ضرور کوئی حور ہے۔ اور جنت سے آب و ہوا تبدیل کرنے کی غرض سے یہاں لائی گئی ہے وہ بڑبڑا رہا تھا۔

آپ کی مرضی تو یہی ہو گی کہ ہم اس قصہ کو طول ہی دیتے جائیں۔ سو ایسا تو ہم ہرگز نہیں

کر سکتے آپ خود عقلمند ہیں آگے حسب پسند قصہ جوڑ لیجیئے۔ اس پلاٹ سے ہمارا مقصد صرف یہ تھا کہ آپ کو جتا دیا جائے کہ آجکل ہیروئن کو کس قدر اچھالا جاتا ہے۔ اسکے حسن کی کس قدر پبلسٹی کی جاتی ہے۔ خیر مانا کہ اس افسانہ کی ہیروئن واقعی خوبصورت ہوگی لیکن یہ ماننے کے لئے ہم ہرگز تیار نہیں کہ ہر افسانے کی ہیروئن خوبصورت ہی ہو۔ لیجئے ہم عام روش سے ہٹ کر ایک نئی طرز کی ہیروئن پیش کرتے ہیں اور کچھ نہیں تو ذرا جدت ہی پیدا ہو جائے گی ذرا پیچھے پیچھے ہٹ جایئے پردہ اٹھا چاہتا ہے

سوانح ہیروئن

ہیروئن کا وطن ہیروئن کے اصلی وطن کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا اس کے متعلق مورخین میں اختلاف رائے ہے کہ ہیروئن والے دراصل ایمیزن کے طاس کے رہنے والے تھے اور بعض یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ لوگ نیپال یا بھوٹان سے بھاگ کر پیدل یہاں آئے ہیں۔ سب سے قوی اور عمدہ خیال یہی ہے کہ ان کا اصلی وطن "لنکا" ہے۔ جس کے متعلق مشہور ہے کہ اسکا ہر چھوٹا باون ہی گز کا اور یہ محاورہ یہی لوگ بستر میں باندھ کر اپنے ہمراہ لائے تھے ان کے شجرہ نسب سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ دراصل ہنومان فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ ہنومان ہیروئن کے والد کے دادا کے پرداد اتھے۔ اتنی دور کا رشتہ ہونے کے باوجود بھی نجانے کس طرح ہیروئن ہنومان سے مشابہت رکھتی ہے ——————— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آواگون کی رو سے اب کے بار ہنومان ناری کا روپ دھا کر اپنی ہی

فیملی میں جنم لے بیٹھے ہیں۔ اچھا ہی ہوا اوّل خویش بعد درویش۔

ہیروئن کی طرزِ معاشرت

ان کے آباؤ اجداد تو پھونس کی جھونپڑیوں میں رہتے تھے لیکن زمانے کے ساتھ ساتھ ہیروئن والوں نے بھی ترقی کی اور اب نوبت باین جا رسید کہ ہیروئن والوں کی رہائش آج کل بنگلوں میں ہے پہلے پہل تو یہ لوگ قبیلوں کی صورت میں بٹے ہوئے تھے لیکن ہیروئن کے ابّا نے، روز روز کی خانہ جنگی یا دانتا کل کل سے تنگ آکر آخر علیحدگی اختیار کی ـــ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ مستقل سکونت کہاں اختیار کی جائے۔ ہیروئن کے بھیّا نے کان کھجا کر اپنی حقیر رائے یہ پیش کی کہ کیوں نہ ہم تم دنیا کی سیر و سیاحت کریں اس طرح ایک تو معلومات میں اضافہ ہوگا دوسرے زندگی کے نشیب و فراز سے دوچار ہو کر کچھ تجربات بھی حاصل ہوں گے۔ ہیروئن کے ابا کی آنکھیں یہ سن کر مارے خوشی کے چمک اٹھیں۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ انہیں کے فرزند ارجمند بھی اس قسم کی کوئی رائے پیش کر سکتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سب رخت سفر باندھ راہی وساور ہوئے۔ روم۔ حجاز۔ ایران ترکستان، بلوچستان وغیرہ سے پھرتے پھراتے آخر کار یہاں آن پہونچے اور یہیں دھرنا دھر لیا۔ اپنی رہائش کے لئے ایک نہایت معقول سا بنگلہ تعمیر کروایا۔ اس بنگلہ میں کل بارہ کمرے تھے۔ یہ سب کمرے مختلف ناموں سے پکارے جاتے ہیں مثلاً ایرانی کمرہ پنجابی کمرہ۔ بلوچستانی کمرہ۔ عربی کمرہ وغیرہ۔ ایرانی کمرہ صرف اس وجہ سے ایرانی کہلاتا ہے کہ یہاں چند ایرانی قالین رکھے ہیں۔ پنجابی کمرہ بھی اسی طرح کہیں دریوں چارپائیوں وغیرہ کی رعایت سے پنجابی کمرہ کہلاتا ہے ہیروئن کی امی کو

اگر انہی کمروں میں سے کسی چیز کی ضرورت ہو تو یوں آواز دیتی ہیں۔ اری گلشن جاذری بنگالی کمرے سے رس گلے نکال لا، ساتھ ہی پنجابی کمرے سے دو دریاں بھی لیتی آنا۔ اور ہاں عربی کمرے میں کھجوریں رکھیں ہیں۔ آرام سے اٹھالا۔

مالی انتظام ہیروئن کا خیال ہے کہ مالی انتظام اسے کہتے ہیں کہ گھر کا مالی ہٹا دیا جائے۔ سو اس نے نہایت دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے فوراً مالی کو برطرف کر دیا اور باغبانی کے فرائض خود انجام دینے لگی تاکہ اخراجات میں کچھ کمی ہو

مذہبی پالیسی ہیروئن کو ہر مذہبی کتاب پر پورا عبور حاصل ہے۔ وید۔ رامائن بھگوت گیتا۔ بائبل یہ تمام کتابیں اس نے ساڑھے آٹھ ماہ کی عمر میں حفظ کر لی تھیں۔ وہ کچھ عرصہ بھگتوں کے ساتھ پھرتی رہی وہاں بھی سکونِ قلب میسر نہ ہوا تو جین مت پر لٹو ہو گئی اکتا کر نن بن گئی آخر کار اسلام قبول کیا۔ اور مستقل طور پر مسلمان ہو گئی۔ آئندہ کسی مذہب کیطرف رجوع کرنیکا کوئی ارادہ نہیں

سوشل اصلاحات ہیروئن کی سوشل اصلاحات قابل تعریف ہیں اس نے سب سے پہلے ڈائننگ روم بنا ڈالا۔ صرف اس لئے کہ ڈرائنگ روم میں چاروں طرف کھڑکیاں اور دروازے شیشے کے تھے اور چاندی کے برتن چوری ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ ڈرائنگ روم نسبتاً محفوظ تھا۔ لہذا یہ اصلاح عمل میں آئی۔ تمام فالتو بلب اتروا دیئے گئے تاکہ گھر والوں کی غیر موجودگی میں نوکر خواہ مخواہ شب برات نہ منا بیٹھیں۔ اس کے علاوہ اینٹی سماں لا۔ Antiqu- salitea پاس کیا گیا۔ جس کی رو سے ہر آنے والے مہمان کی تواضع گرمیوں میں گرم چلئے پلا کر اور سردیوں میں کولڈ ڈرنک پیش کر کی جاتی۔ تاکہ مہمان ایک مرتبہ آکر

آئندہ کے لئے کبھی دوبارہ آنے کا نام تک نہ لے۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ سکوئش کے جگ پر ٹی کوزی ڈھک دی جاتی اور جب ٹرے سامنے آتی تو مہمان یہی سمجھتا کہ گرما گرم چائے آ رہی ہے ناچار بیچارے مہمان کو مارے شرم کے اتنی سردیوں میں بھی سکوئش پینی پڑتی۔ اسی طرح گرمیوں میں شیشے کے جگ میں چائے پیش کی جاتی۔ دل میں تو مہمان کو پیاس لگی ہوتی ظاہراً خاموشی سے گرم چائے پی کر ہیروئن کو کوستا رہ جاتا یہی وجہ تھی کہ ہیروئن کے گھر دور دور تک مہمان کا نشان تک نہ تھا۔ یہ تھی ہیروئن کی مختصر سی ہسٹری۔ خیر یہ خشک باتیں اس لئے بتائی گئیں کہ آپ کو معلوم ہو جائے ہیروئن کس شخصیت کی مالک ہے اور کس فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ آپ غالباً ہیروئن کا نام جاننے کیلئے بے حد مشتاق ہوں گے۔ سو ہم ہرگز بتانے کے لئے تیار نہیں۔ اب ہم سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ عام افسانوی ناموں کی طرح اس ہیروئن کا بھی کوئی چھچھورا سا نام رکھ دیں۔ مثلاً گل نگار۔ گل داؤدی۔ گل شبو۔ گل بنفشہ۔ گل زکام وغیرہ وغیرہ اگر ناموں میں جدت پیدا کرنے کی یہی رفتار رہی تو وہ دن دور نہیں کہ اس قسم کے نام بھی سننے میں آیا کریں گے۔ جیسے گل گوبھی۔ گل چقندر۔ برگ نیم۔ گل بھنڈی۔ صرف گل نام رکھ کر آگے خواہ کسی چیز کا نام لے دیا جائے سو ہم یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتے لہذا ہیروئن کو آپ ہیروئن کہہ سکتے ہیں۔ ہاں تو ہیروئن ابھی ڈھنگ سے مالی انتظام اور سوشل اصلاحات بھی نہ کرنے پائی تھی کہ اچانک اس کی زندگی میں اس کا پھوپھی زاد ہیرو داخل ہوا۔ یہ حضرت صرف حصول تعلیم کی غرض سے اپنے ماموں میاں کے ہاں ٹھہرائے گئے تھے پہلے پہل تو ہیروئن نے ہیرو کو دیکھ کر ناک سکوڑلی۔ کہ واہ بھئی واہ کیا کھیرا سا آدمی ہے۔ اور ادھر ہیرو صاحب نے کنکھیوں سے ہیروئن کو دیکھنے کے بعد

سوچا کہ کیا عمدہ بھوبل میں دبایا ہو بینگن ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر ترس کھایا کرتے رحالانکہ دونوں ایک دوسرے کے لئے موزوں تھے ہیروئن اکثر سوچا کرتی کہ کون مسخری لڑکی ان کی بیوی بنے گی اور ہیرو کے خیالات بھی ہیروئن کے متعلق کچھ اسی قسم کے تھے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک دن جب کہ موسم بے حد سہانا ہو رہا تھا ہیرو کالج سے جلد لوٹ آیا گو گھر سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ دل ہی دل میں جھنجلا رہا تھا کہ قدرت نے کس گناہ کی پاداش میں یہاں لا پھینکا۔ اپنے کمرہ میں پہنچ کر اس نے تمام دریچے کھول دیئے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اسے بے حد بھلے معلوم ہوئے اس نے دریچے سے منھ نکال کر باغ کی طرف جھانکا اے! یہ اتنے بڑے سائز کا بھنورا چمن میں کیسے آگیا۔ نزدیک چل کر مشاہدہ کرنا چاہئے۔ یہ سوچ کر وہ دریچے سے کود کر عین گلاب کی کیاری کے پاس جا پہنچا۔ ہیں۔ آپ! وہ حیرانی سے چلایا۔ جی ہاں میں ہیروئن نے بغیر دیکھے بے پروائی سے جواب دیا۔ میں م۔ میں۔۔۔ سمجھا کہ۔۔۔۔ ہیرو ہکلا کر بولا۔ کیا سمجھے آپ ہیروئن جھلا کر بولی۔ جی۔۔۔ جی کچھ نہیں۔ دراصل مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ روز اس وقت باغبانی کیا کرتی ہیں۔ ہیرو سہم کر بولا تو اب معلوم کر لیجئے کہ میں روز اس وقت باغبانی کیا کرتی ہوں۔ ہیروئن نے بدستور ناراضگی سے کہا۔ ہیرو کو یہ بدمزاجی کی ادا دل سے پسند آئی اس نے دل میں سوچا غور سے دیکھ لیا جائے تو کیا حرج ہے شاید کوئی کام کا نقش ہاتھ آجائے یہ سوچ کر اس نے اپنی نگاہیں ہیروئن کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اسے آج پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہوا کہ ہیروئن اتنی بدصورت نہیں رہی جتنی کہ وہ سمجھا کرتا تھا ناحق بے چاری پر بدصورتی کا الزام لگایا۔ لعنت ہے مجھ پر جو خواہ مخواہ اسے بھنورے

سے تشبیہ دی۔ مانا کہ سیاہ لباس میں اسکا زرد چہرہ اسے بالکل بھونرا بنا کر پیش کر رہا تھا لیکن اس میں میرا کیا قصور اُسے بھی تو سیاہ لباس نہیں پہننا چاہیے تھا۔ ہیروئن اسے اپنی طرف گھورتے دیکھ کر زیادہ برداشت نہ کرسکی۔ اور ڈپٹ کر بولی اس طرح کیوں گھور رہے ہیں۔ آپ! لاحول ولاقوۃ یہ کہکر وہ الٹے پاؤں اپنے کمرے میں چلا آیا اور خود کو ایک آرام کرسی پر دھم سے گرا کر سوچنے لگا۔ کس قدر نازک مزاج پایا ہے۔ یعنی گھورنا بھی گوارا نہیں۔ سبحان اللہ۔ ادائیں تو بالکل حسینوں والی ہیں۔ (ماتھا پیٹ کر) خواہ مخواہ اتنا وقت ضائع کیا اگر تعلیم کے ساتھ ساتھ محبت کی پریکٹس بھی جاری رہتی تو خوب تھا۔ خیر اب بھی کچھ نہیں گیا۔ دیر آید درست آید۔ یہ سوچ کر اس نے گھڑی دیکھی اور اپنی نوٹ بک پر تاریخ اور وقت لکھ کر محبت کی پریکٹس شروع کر دی۔

ادھر ہیروئن نے باغبانی سے فارغ ہو کر سوچا کہ میں نے خواہ مخواہ زیادتی کی، بے چارہ سہم کر چلا گیا۔ کتنا شرمیلا ہے مجھ سے بھی زیادہ۔ اور کچھ اتنا بدصورت بھی نہیں لیکن میرا کیا قصور؟ اس کے لہجے سے صاف طنز ظاہر تھا۔ شاید وہ میرا مذاق اڑانا چاہتا ہو۔ لیکن کہیں بھی تو نہیں۔ بھلا میرا مذاق کیوں اڑانے لگا جب کہ خود مجھے بدتر ہے۔ ضرور مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا خیر اچھا کیا گربہ کشتن روز اول۔ کچھ رعب بھی تو ہونا چاہیے خواہ مخواہ سر پر چڑھ جاتا۔ خیر آج سے اس پر کڑی نگرانی رکھنا پڑے گی۔ کچھ دنوں سے وہ نوٹ کر رہی تھی کہ بجلی کا بل زیادہ آنے لگا ہے۔ اسنے ایک دو مرتبہ نوکر کو کسی بہلانے سے ہیرو کے کمرے میں یہ دیکھنے کے لئے بھیجا کہ چھوٹے صاحب کیا کر رہے ہیں کوئی کتاب پڑھتے ہیں یا رسالہ؟ نوکر ہیروئن سے بڑھ کر مجسس تھا فوراً کھوج نکال لایا کہ بیگم صاحبہ چھوٹے صاحب کچھ پڑھ وڑھ نہیں رہے بلکہ کچھ کاگر کاغذ پر لکھے جا رہے ہیں ہیروئن

نے دوبارہ بھیجا کہ ذرا غور سے سن کر آؤ وہ کیا گا رہے ہیں بھاگ کر آنا نوکر فوراً آ گیا اور آ کر بتایا جی بیگم صاحبہ چھوٹے صاحب ناک میں گاتے ہیں میرے کو تو یہ سمجھ لگی۔ ہیرو ئن تجسس سے بولی۔ ہاں ہاں کیا ؟ نوکر نے کہا۔ تیری جندگی ہے بالم ندی ہیں اک ٹھکارا۔ ہیروئن ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی کہیں یوں تو نہیں تھا میری زندگی ہے ظالم تیرے غم سے ٹھکارا ہاں ہاں بیگم صاحب ایسے ہی تھا میری جندگی نہیں تیری جندگی کہہ رہے تھے ہیروئن بولی خیر تیری میری چھوڑ دیسے تو دعوے سے کہہ سکتا ہے کہ یہی کچھ گا رہے تھے۔ نوکر واہ جی بیگم صاحبہ ہم آپ سے جھوٹ کہے گا وہ تیری جندگی کے گانے گا رہے تھے خود جا کر پوچھ لیویں اور ساتھ ساتھ رو بھی رہے تھے ہیں ! رو بھی رہے تھے ہیروئن پیچ کر بولی اچھا اچھا جا بھاگ اب ہیروئن اس تاک میں رہنے لگی کہ کس طرح وہ تمام مسودات پڑھے جائیں جو ہیرو اتنی رات گئے تک لکھتا رہتا ہے۔ آخر اسے ایک سنہری موقعہ مل ہی گیا ہیرو ہیروئن کی امی سے کہہ رہا تھا آج شام کھانے پر میرا انتظار نہ کیا جائے میں گھر دیر سے لوٹوں گا۔ ہیرو کے جانے کے فوراً ہی بعد ہیروئن دبے پاؤں اس کے کمرے میں داخل ہوئی چاروں طرف کچھ سونگھ کر میز کی دراز سے تمام مسودے برآمد کئے۔

لق و دق صحرائی

یہ تھا ہیرو کا تخلص جسے پڑھ کر مارے ہنسی کے ہیروئن کی چیخیں نکل گئیں۔ اچھا تو تخلص ہے جناب کا۔ اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ صحرائے گوبی ہی اپنا تخلص لکھ لیتے۔ خیر آگے پڑھوں کیا لکھتے ہیں ہیروئن غور سے پڑھنے لگی۔ . . . . تم مجھے اس لق و دق صحرا میں ایک اونٹنی کی طرح نظر آئیں اور تمہارے قدم خود بخود میری طرف بڑھنے لگے تمہیں اس دن باغبانی کرتے دیکھ کر نہ جانے کیوں کنپٹیوں میں شہنائیاں بجنے لگیں۔ میں نے اسی وقت

مصمم ارادہ کیا کہ اگر کبھی شادی کرنے کی حماقت بھی کی تو صرف تم سے کروں گا! ایمان سے تم روز خوابوں میں اگر خواہ مخواہ ہم شریف لوگوں کو تنگ کیوں کرتی ہو خدا کی قسم تم باغبانی کرنا چھوڑ دو تو اچھا ہے باقی آئندہ۔ ہیروئن یہ سب کچھ پڑھ کر فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی کہ سب کچھ اسی کے متعلق لکھا گیا ہے واقعی اسے باغبانی چھوڑ دینی چاہیے اور اس نے کیا بھی ایسا ہی۔ وہ اکثر ہیرو کے افسانے چوری سے پڑھ کر اس کی محبت کا اندازہ کیا کرتی ہیرو بھی بدستور محبت کئے جا رہا تھا کہ اچانک ہیروئن کی خالہ زاد بہن ہیروئن سے ملنے ان کے گھر آئی ہیروئن کی امی نے چند دن اسے پاس ٹھہرا لیا۔ ہیرو نے جو نسبتاً بہتر مال دیکھا تو فوراً ہی پینترا بدل کر اس سے محبت کرنے پر کمربستہ ہو گئے۔ چونکہ ہیروئن کو ہیرو کے اپنے متعلق افسانے پڑھنے کی عادت پڑ چکی تھی لہذا ہیرو کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا اسی خالہ زاد بہن کو ہمراہ لئے جو اب ہیروئن کی رازدار بن چکی تھی۔ ہیرو کے کمرے میں جا دھمکیں، پہلے کی طرح میز کی دراز سے نیا مسودہ نکال کر پڑھنا شروع کیا۔ اس مرتبہ ہیرو نے اپنے دل چرچھنکار بھیجی ہوئی تھی۔ ہیروئن کی خالہ زاد بہن بہ آواز بلند پڑھنے لگی اے لق و دق صحرائی کے ناتجربہ کار دل! تو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ کاش تو میرے پہلو میں نہ ہوتا تو میں کتنا خوش قسمت تھا۔ یعنی اے میرے غدّار دل! تو ہی انصاف کر میں تجھ سے نہ کہتا تھا کہ یہ بھنورا ثانی بجو بار کہ "لڑکی محبت کرنے کے ہرگز قابل نہیں لیکن تو مجھے نہ جانے کیا کیا سبز باغ دکھاتا رہا ناچار مجھے تیرے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا اب پے کیا کہہ رہا ہے کہ یہ کون سی حسین ہے۔ مانتا ہوں کہ یہ بھی کچھ زیادہ حسین نہیں لیکن پہلے والی سے تو بدرجہا بہتر ہے۔ رنگ تو اس کا بھی سیاہ ہے لیکن اس سے کم۔ پاؤں تو

اس کے بھی بڑے ہیں لیکن اس سے کم غرضکہ اس کی ہر چیز اس سے نسبتاً بہتر ہے پھر کیوں میں تیرا کہا مانوں بس اب تو مجھے اجازت دے تاکہ اس نئی چمگادڑ سے اظہار محبت شروع کردوں، ابھی تو اس کے جانے میں کافی دن باقی ہیں اب کل سے میں اسے اپنے خوابوں میں بھی ضرور لایا کروں گا۔ کرلے میرا کیا کرتا ہے تف ہے تجھ پر اے میرے ناہنجار دل! وہ ابھی اتنا ہی پڑھنے پائی تھیں کہ دروازے پر کچھ آہٹ ہوئی اور ہیرو صاحب اطمینان سے سیٹی بجاتے داخل ہوئے۔ دونوں کو یہاں پاکر چکرا گئے ہیروئن اور اس کی خالہ زاد بہن مارے غصّے کے تھر تھر کانپ رہی تھیں کہ ان دونوں پر بدصورتی کا الزام لگاتے ہوئے بھی محبت کی گئی ہے ہیروئن اسے دیکھتے ہی کڑک کر بولی۔ کیا تم بہت حسین ہو ذرا آئینہ لے کر اپنا دو منزلہ چہرہ بھی کبھی دیکھا ہے! انسان نہیں گھوڑے ہو گھوڑے کم بخت کھیرے نما صورت لے کر چلے ہیں عشق کرنے دفعان ہو جاؤ میرے سامنے سے ہیروئن کی خالہ زاد بہن نے انتقام لینے کی دھمکی دی! اور ہیرو سے کہا کہ اگر وہ صبح تک اس گھر سے نو دو گیارہ نہ ہوا تو وہ دونوں اسے رضائی میں لپیٹ کر کنشک وردھن کی طرح موت کے گھاٹ اتار دیں گی ہیرو پر اس دھمکی کا نمایاں اثر ہوا صبح نوکر جب چائے لے کر ہیرو کے کمرے میں گیا تو ہیرو کا کہیں پتہ نہ تھا صرف میز پر ایک لفافہ ہیروئن کے والد کے نام تھا جس میں ہیرو نے اپنے جانے کی کوئی معقول وجہ پیش کردی تھی اور ساتھ ہی یہ لکھ دیا تھا کہ ماموں میاں میں ناراض ہو کر نہیں جارہا بلکہ اس کمرے سے مجھے نہ جانے کیوں وحشت سی ہوتی ہے اب انشاء اللہ تمام عمر آپ میری صورت نہ دیکھیں گے ـــــ خدا حافظ۔

دلربا

راجندر راجن

دلربا

اگر اس نام کی کوئی فلم بنی ہے یا بننے کا امکان ہے تو محض اتفاق ہوگا۔

(پردہ اٹھنے پر ایک نہایت آراستہ کمرے کا منظر کھلتا ہے اس کمرے کو ڈرائنگ روم بھی کہا جا سکتا ہے اور ذرا رعایت سے دیکھا جائے تو آرٹ اسٹوڈیو بھی کہا جا سکتا ہے بہر حال یہ کمرہ بیک وقت پروڈیوسر بالم صاحب کا مکان، دفتر اسٹوڈیو اور اڑتی چڑیوں کو پھانسنے کا پھندہ ہے بالم صاحب اس وقت ایک قہقہے میں بڑی تندہی سے مصروف ہیں ــــ

پروڈیوسر بالم۔ (آواز میں ابھی قہقہے کا چٹ پٹا پن باقی ہے۔) گدھا مسٹر جھُن جھُن والا۔ بالکل گدھا۔ میں کہتا ہوں سیٹھ ایک دم گدھا ہے رمتانت سے) لیکن اسے قابو میں کرنے کے لئے ذرا TACT کی ضرورت ہے

ڈائریکٹر جھن جھن والا۔ تو پھر بات پکی ہو گئی نا۔
پبلسٹی مینجر۔ اجی آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں ڈائریکٹر صاحب
آپکے جنگل میں تو خود شیطان بھی پھنس جائے سیٹھ بے چارہ کس باغ کی مولی ہے۔
پروڈیوسر۔ (کاروباری انداز میں) تھینک یو مسٹر خربوزے والا
مینجر۔ دیکھئے بالم صاحب میں آپ سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میرا نام خربوزے والا نہیں۔ میرا نام ہے۔ ایچ۔ ایچ۔ ایم۔ ایس پیٹھا والا۔
پروڈیوسر۔ آئی ایم ساری مسٹر پیٹھا والا۔ نہ جانے کیوں آپ کے سر کو دیکھ کر مجھے خربوزہ یاد آجاتا ہے۔ مگر تم ــــــــ"
مینجر۔ شکریہ۔
پروڈیوسر۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ سیٹھ گدھا ہے اور سچا بزنس مین وہ ہے جو ضرورت پر گدھے کو بھی باپ کہنے سے گریز نہ کرے۔ فنانس کی بات پکی ہو گئی ہے اب سیٹھ صاحب سے چند باتوں کا فیصلہ کرنا ہے اسی لئے تو آج میں نے تم لوگوں کو یہاں آنے کی تکلیف دی ہے لیکن ابھی تک رومانی صاحب تشریف نہیں لائے۔
مینجر۔ وہ برساتی مینڈک!
پروڈیوسر۔ بجا ہے مسٹر پیٹھا والا مگر مارکیٹ میں اس کا نام بکتا ہے اور پھر وہ ہماری آئندہ فلم کا میوزک ڈائریکٹر بھی ہے۔ چنانچہ پبلسٹی مینجر کی حیثیت سے تو اسے کچھ اور کہنا چاہئے۔

منیجر۔ میں جانتا ہوں بشہنشاہ نغمہ، خدائے موسیقی زندگی کے دھڑکتے ہوئے دل کو ٹٹولنے والا شاعر اعظم، مظلوموں کی آواز کو اٹھانے والا باغی شاعر غریبوں کے بہتے ہوئے زخموں پر محبت کا پھاہا رکھنے والا کوی، جنتا کا اپنا شاعر، مہا کوی حضرت پیالہ رومانی۔

پروڈیوسر۔ واہ زندہ باد پبلسٹی منیجر (عین اس وقت کلاک گھنٹہ بجاتا ہے، یہ کیا ساڑھے پانچ ہو گئے اور سیٹھ صاحب ابھی تک نہیں آئے۔

(فقرہ ختم ہوتے ہی سیٹھ کروڑی مل داخل ہوتے ہیں۔ سیٹھ صاحب بھاری بھرکم جسم کے ہیں۔ بید کی چھڑی ان کے بوجھ سے جھکی جا رہی ہے اور جوتے کی چرمر کے ساتھ سانس کی دھونکنی برابر بج رہی ہے۔)

پروڈیوسر۔ (دبی آواز میں) کھڑے ہو جاؤ مسٹر جھن جھن والا سیٹھ صاحب آ گئے (اچھل کر) آہا۔ آئیے آئیے سیٹھ صاحب تشریف رکھئے۔

سیٹھ۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے پھولی ہوئی سانس میں) میرے کو دیر تو نہیں ہوئی۔

پروڈیوسر۔ جی بالکل نہیں۔

سیٹھ۔ انگریز چلا گیا۔ مگر ہم نے ایک بات اس سے سیکھ لی۔

پروڈیوسر۔ وہ کیا؟

سیٹھ۔ سمے کی پابندی۔ دیکھو پانچ بجے کا وچن دیا تھا۔

منیجر۔ مگر اب تو ساڑھے پانچ بج چکے ہیں۔

ڈائریکٹر۔ مسٹر بیچھا والا پان سات منٹ کا کیا ہے پانچ اور ساڑھے پانچ میں

فرق ہی کتنا ہے۔

پروڈیوسر۔ جی ہاں۔ بالکل بالکل۔ ہاں تو سیٹھ صاحب میں کہہ رہا تھا کہ یہ ہیں مسٹر چھُن چھن والا ہمارے ڈائریکٹر، "سرکٹا جوان" "خاموش باتیں" اور "سسر داماد" کے شہرت یافتہ اور یہ ہیں مسٹر اتیج ایم۔ ایم۔ اتیج۔ ایس الیف سپھا والا۔ یہ ہمارے پبلسٹی مینیجر ہیں ان کا کام یہ ہے کہ آپ کو مجھے، ڈائریکٹر صاحب کو، ہمارے فلم اسٹارز کو پبلک کی نظروں میں ہیرو بنا دیں۔

سیٹھ۔ خی خی خی۔ کبھی میرا کھُود کا بھی ہیرو بننے کا بڑا وچار تھا مگر اب تو میں اتنا موٹا ہو گیا ہوں۔

ڈائریکٹر۔ اجی آپ کیا کہہ رہے ہیں سیٹھ صاحب۔ آپ فرمائیں تو آپ کو ایسا چوٹی کا کیرکٹر ایکٹر بناؤں کہ دنیا لوہا مان جائے۔

مینیجر۔ اور میری پبلسٹی سے دنیا آپ کا تانبہ بھی ماننے لگے۔

سیٹھ۔ کھیر۔ میرے کو تو سونا ہی ٹھیک ہے۔

پروڈیوسر۔ جی ہاں جی ہاں۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ "آمدن بر سر مطلب" یعنی اب ذرا کام کی بات کی جائے۔ آپ کچھ چائے وغیرہ نوش فرمائیں گے؟

سیٹھ۔ جی نہیں۔ ہاں پان پتہ ہو تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مینیجر۔ البتہ۔

پروڈیوسر۔ (گھنٹی بجاتے ہوئے) چپراسی بھاگتا ہوا آتا ہے) چپراسی۔ حضور۔

پروڈیوسر۔ چپراسی دیکھو آٹھ پان لاؤ۔ چونا سادہ (چپراسی چلا جاتا ہے) ہاں تو

سیٹھ صاحب میں کہہ رہا تھا کہ "آمدن بر سر مطلب" یعنی کام کی بات کی جائے۔ مہورت کا دن توطے ہو گیا۔ دیوالی کے شبھ دن شری اندھیر اسٹوڈیو میں ہماری پکچر کا مہورت ہو گا۔

سیٹھ:۔ اے ٹھیک اے۔ اے ٹھیک لے شبھو گھڑی کا کھیال ہونا ہی چاہیئے

پروڈیوسر۔ اس کے بعد آتی ہے سٹوری۔ اجی ہمارے ڈائریکٹر صاحب کے پاس ایک ایسا SUBJECT ہے ایک ایسی کہانی ہے کہ آپ نے پہلے کبھی سنی نہ ہو۔ نیا پلاٹ، نئی کہانی، نیا رنگ، نئے ڈھنگ، آہا ہا بس لطف آگیا

ڈائریکٹر۔ (فوراً سیٹھ صاحب کے قریب آ کر) سیٹھ صاحب جب میں پکچر OPEN کرتا ہوں تو ایک ویران باغ کا سیٹ لگا ہوا ہے۔ ایک سوکھے ہوئے پیڑ کے نیچے، چٹان پر ہیروئن اداس سی بیٹھی ہے اس کے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں اس کی نظریں۔ (الفاظ کی کمی کی وجہ سے بیان نہیں کر پاتا)

مینیجر۔ (فوراً ڈائریکٹر کی بات کو جاری رکھتے ہوئے) اس کی نظریں دور بہت دور کسی کو دیکھ رہی ہیں۔

ڈائریکٹر۔ تھینک یو مسٹر پٹھا والا (سیٹھ سے) کیمرہ PROCEED کرتا ہے چاروں طرف BABYLIGHTS رکھی ہیں۔ سکرین پر ہیروئن کا کلوز اَپ آتا ہے۔ اس کی بڑی بڑی آہو چشم آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں (مینیجر کھانستا ہے) اس کے گلابی گالوں پر ایک سیاہ کاکل مچل رہی ہے اس کے رس بھرے ہونٹوں پر بے رونقی چھا رہی ہے۔ (ایک دم لہجہ بدل کر) اور پھر کیمرہ ٹرک بیک ہوتا ہے۔ لانگ شاٹ میں ہیرو

پہاڑوں کو چیرتا ہوا ندیوں کو پار کرتا ہوا ہیروئن کی طرف بڑھ رہا ہے اس کی پوشاک بوسیدہ ہے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ سر پر کفن باندھے ہوئے ہے، پیروں میں چھالے پڑ گئے ہیں اسے دیکھتے ہی ہیروئن کا اداس مکھڑا کھل جاتا ہے وہ چٹان سے کود پڑتی ہے گرتی ہے مگر اٹھ کر بڑھتی ہے اور اور ہیرو سے لپٹ جاتی ہے۔ کیمرہ ایڈوانس کرتا ہے۔ دونوں کا کلوز اپ ہیروئن کہتی ہے "نیل کنٹھ میں گر پڑی" ہیرو جواب دیتا ہے "گرنا آسان ہے بلبل مگر گر کر اٹھنا مشکل ہے۔" اور وہ چلا جاتا ہے۔ ہیروئن اس کے پیچھے بھاگتی ہے۔ دریا، جنگل، شیر، بیابان، دور بڑی دور سانس پھول جاتی ہے اس لئے سلسلۂ کلام ٹوٹ جاتا ہے)

منیجر۔ بڑی دور، دور بڑی دور وہاں جہاں زمین اور آسمان مل جاتے ہیں جہاں دو دل مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ جہاں دو پریمیوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کا کوئی انتظام نہیں۔

سیٹھ۔ (متاثر ہو کر) کہانی تو کھوب ہے۔ بلم جی۔ آپ کے ڈائریکٹر تو بڑے گنی آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

ڈائریکٹر۔ جی آپ کی ذرّہ نوازی ہے۔

منیجر۔ اجی کیا دماغ پایا ہے انہوں نے۔ اُف غور تو کیجئے سیٹھ صاحب۔ ہیرو سر پر کفن باندھے کھڑا ہیروئن سے کہہ رہا ہے گر کر اٹھنا مشکل ہے۔ آئے ہائے بس منہ چوم لوں کیا بات کی ہے جوانی قسم ساری کلچر اسماج اور سبھیتا کی آئینہ داری کر دی ہے۔ ایک فقرے میں تیس کروڑ جنتا کے دھڑکتے

ہوئے دل کی بات کہہ دی۔ زندہ باد جھن جھن والا۔

پروڈیوسر۔ (متانت سے) ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ ہے پلاٹ۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا پکچر کامیڈی ہونی چاہیئے یا ٹریجیڈی۔ آپ کا کیا خیال ہے مسٹر جھن جھن والا؟

ڈائریکٹر۔ میرے خیال میں تو ٹریجیڈی ہی ٹھیک رہے گی کیونکہ آج کل لوگ اگر پکچر ہاؤس سے آنسو پونچھتے ہوئے نکلیں تو پکچر کو اچھا کہتے ہیں۔

مینیجر۔ آپ بجا فرما رہے ہیں مسٹر جھن جھن والا۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ آپ نے ساری تیس کروڑ جنتا کے دل کی بات کہہ دی۔ رونے میں جو سچی خوشی ملتی ہے۔ گم ہو جانے میں جو مزہ ہے، تڑپنے میں جو لطف ہے وہ پھیکی ہنسی میں کہاں اور پھر ایک حسین لڑکی کے آنسو تو پتھر کو بھی موم بنا سکتے ہیں۔

سیٹھ۔ اے بات تو ٹھیک چے من اچرچی پر میرا کھیال کچھ دوسرا اے۔

پروڈیوسر۔ فرمائیے۔

سیٹھ۔ میرا کھیال ایسا ہے کہ چھورا چھوری کا پریم ہو جاتا پھر بیچ میں دوسرا چھورا آجاتا ہے وہ تمہارا ہیرو کے من پر جادو ڈالتا ہے۔

مینیجر۔ (زیرِ لب) اور ہیروئن سیٹھ صاحب کے ساتھ چوپاٹی کی سیر کو نکل جاتی ہے

سیٹھ۔ آپ نے کچھ میرے کو کہا۔

مینیجر۔ جی نہیں میں ذرا سوچ رہا تھا۔

پروڈیوسر۔ جی دوسرا چھوری ہیرو کا من پر جادو ڈالتا ہے۔

سیٹھ۔ ہاں اور ہیروئن گریب ہے۔ ہیرو کا باپ بہت دھنی ہے۔ اور وہ کچھ پبلشر وگیرہ ہے۔ اور دوسرا چھوری کو اچھا مانتا ہے۔ ہیروئن بھگوان کا مورتی کے آگے بنتی کرتی ہے۔ پریم میں سماج اور ماں باپ کا گھپلا ہوتا ہے۔ ہیرو کا باپ اس کا بیٹا کو گھر سے نکال دیتا ہے۔ ہیرو کا موٹر سے ٹکر ہوتا ہے بس ایسا سب گھپلا وپلا کے بعد ہیروئن ہیرو سے مل جاتا ہے۔

پروڈیوسر۔ (اچھل کر) ونڈرفل آپ نے تو کمال کر دیا سیٹھ صاحب۔ مینیجر صاحب اسے کہتے ہیں۔ بزنس۔ لطف آگیا۔ کیا پلاٹ دیا ہے واقعی ہم لوگ تو محض آرٹسٹ ہی ہیں۔ ہمیں آپ ایسے ایک روشن دماغ بزنس مین کی سخت ضرورت تھی سیٹھ کوڑی مل کروڑی مل جی۔

سیٹھ۔ (مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) ہی ہی۔ ہی ہی۔ میں تو اپنا کھیال بولدیا بلم جی۔

مینجر۔ سیٹھ صاحب آپ کا نام تو بہت لمبا ہے۔

سیٹھ۔ بات اے ہے کہ ایک میرا کھود کا نام ہے۔ اور دوسرا میرا پتا کا۔

پروڈیوسر۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ تو ہوگئی ٹائپ یعنی میوزیکل۔ ٹریجیکل کامیکل میلوڈراما، اب رہا نام کہیے پکچر کا نام کیا ہونا چاہیے۔

(عین اس وقت پیارہ رومانی صاحب داخل ہوتے ہیں بڑے وجیہہ جوان جیسے اکھاڑے کے پہلوان ہوں۔ ایک ہاتھ میں پانوں کا بنڈل دوسرے میں ماچس کی ڈبیہ جس پر برابر تال دیتے آرہے ہیں۔ لباس کم و بیش شاعرانہ۔ دانت اور ہونٹ

پان سے رنگے ہوئے ہیں۔)

پروڈیوسر۔ آہا پیالہ صاحب تشریف لے آئے بھئی آئیے آئیے آپ کا ہی انتظار تھا

مینجر۔ (بلند آواز میں) با ملاحظہ باادب ہوشیار، شاعر عظیم۔ ملک کے واحد فنکار، مہاکوی حضرت پیالہ رومانی تشریف لاتے ہیں۔

پیالہ۔ شکریہ مسٹر پٹھا والا۔ بالم آداب عرض۔ آداب بجا لاتا ہوں قبلہ ڈائریکٹر صاحب۔

دونوں۔ آداب۔ آداب

پروڈیوسر۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ ہمارے WRITER ہیں یعنی ہماری پکچروں کے گانے لکھتے ہیں اور ذرا مزے میں ہوں اور ایک خوب بھری ہوئی ماچس کی ڈبیہ میسر آجائے تو وہ دُھنیں بناتے ہیں کہ سننے والے کے پیروں تلے سے زمین نکل جائے۔ اور پیالہ صاحب یہ ہیں ہمارے فنانسر سیٹھ کوڑی مل کروڑی مل جی۔

پیالہ۔ آپ کے نیاز حاصل کر کے دلی مسرت ہوئی۔

پروڈیوسر۔ اچھا تو میں کہہ رہا تھا کہ اب رہی نام کی بات۔

پیالہ۔ اوہو میں تو بھول ہی چلا تھا "پان کا پتہ"

سیٹھ۔ ہوں۔ نام تو کھوب چے۔

مینجر۔ (فوراً) تیس کروڑ جنتا کا من بھاتا کھاجا دیش کے متوسط طبقے کی ایک جھلک۔

ڈائریکٹر۔ جب میں پکچر OPEN کرتا ہوں تو بیرسٹر صاحب کے دیوان خانے کا سیٹ لگا ہوا ہے کیمرہ PROCEED ——————

کرتا ہے۔ دیوان خانے کا پردہ ذرا ہلتا ہے۔ ایک گورا سا ہاتھ دکھائی دیتا ہے اور پردے کے پیچھے سے ایک نقرئی آواز آتی ہے "پان لے لیجیے"۔

مینیجر۔ واہ واہ۔ کیا OPENING ہے۔

پیالہ۔ جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ چپراسی پان لا رہا تھا۔ میں نے اس سے لے لئے میرا اس سے زیادہ اور کوئی قصور نہیں۔

پروڈیوسر۔ اوہ۔ خیر چھوڑیئے۔ لائیے پان دیجئے۔ (پان لے کر) لیجئے سیٹھ صاحب پان حاضر ہیں (سب ایک ایک پان اٹھا کر منہ میں ڈال لیتے ہیں) ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ پکچر کا نام کیا ہونا چاہئے آپ فرمائیے ڈائریکٹر صاحب!

ڈائریکٹر۔ دیکھئے آج کل لمبے ناموں کا بہت چرچا ہے جیسے "اس سے نہ کہنا" "ہولی کے دن ہولی آئی رے" وغیرہ وغیرہ چنانچہ میرے خیال میں "دل کی دھڑکن" خوب رہے گا۔

مینیجر۔ لیکن دل کی دھڑکن کیوں صرف دھڑکن ہی کیوں نہیں۔ آخر پیر کی دھڑکن تو ہوتی نہیں۔

(کوئی جواب نہیں دیتا۔ چند لمحے خاموشی طاری رہتی ہے۔ صرف پیالہ صاحب ماچس پر تال دے رہے تھے۔)

پروڈیوسر۔ آپ کیا سوچ رہے ہیں پیالہ صاحب؟ (پیالہ صاحب جواب نہیں دیتا) اوں ہوں نہا گوی کسی دھن میں مست ہے۔

پیالہ۔ (ایک دم اچھل کر) مل گیا۔ بالم صاحب آپکی پکچر کا نام مل گیا ملاحظہ ہو (سب ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں۔ پیالہ صاحب چند ثانیے یونہی ماچس

پر تال دیتے رہتے ہیں۔ پھر بڑے انداز سے گا کر) بلم (چٹکی بجا کر) بلم دھیرے بول کوئی سن لے گا۔ (اک دم رک کر) کہئے کیسا ہے۔؟

سب مل کر۔ واہ۔ واہ کیا نام ہے۔ آہا ہا لطف آگیا۔

ڈائریکٹر۔ جب میں پکچر OPEN کرتا ہوں تو ہیروئن کے مکان کا سیٹ لگا ہوا ہے۔ رات کا وقت ہے۔ مکان ٹوٹا پھوٹا ہے۔ ایک طرف پیپل کے پیڑ کے نیچے ہیروئن کھڑی ہیرو کا انتظار کر رہی ہے۔ ہیرو چھپتا چھپاتا آتا ہے اور ہیروئن کو آواز دیتا ہے۔ ہیروئن ہونٹوں پر انگلی رکھ کر دبی ہوئی آواز میں کہتی ہے۔ بلم دھیرے بول کوئی سُن لے گا۔

مینیجر۔ بہت خوب ڈائریکٹر صاحب۔ محبت کی نت نئی داستان۔ جنگ ہو یا امن۔ قحط ہو یا خوشحالی" زندگی ہو یا موت" پیار انسان کو بھاتا ہے اور دل کی دھڑکن گیت بن جاتی ہے اور وہ گیت ہوتا ہے (ذرا سُر سے) بلم دھیرے بول کوئی سن لے گا۔

پیالہ۔ واللہ کیا گفتار ہے۔

پروڈیوسر۔ لیکن ایک بات ہے۔ لمبے نام بہت عام ہو رہے ہیں اس لئے اگر کوئی مختصر نام ہو تو خوب ہے۔

مینیجر۔ میں عرض کروں؟

پروڈیوسر۔ فرمائیے۔

مینیجر۔ "بجلی" کیسا۔ نام رہے گا۔

پروڈیوسر۔ اوہوں۔ بالکل سٹنٹ پکچر کا نام معلوم ہوتا ہے۔

سیٹھ۔ اے بات ٹھیک چے اپنا تو سوشیل پکچر ہو گا۔
مینیجر۔ اچھا تو "رسیلی" کے بارے میں کیا خیال ہے۔؟
پیالہ۔ (ماچس پر تال دے کر گاتا ہے) رسیلی رسیلی رسیلی۔ او او رسیلی۔ (وزن ٹھیک نہیں بیٹھتا) اُوہوں ٹھیک نہیں بیٹھتا۔
مینیجر۔ تو پھر "برساتی مینڈک" کیسا رہے گا۔
پیالہ۔ (رعب سے) شٹ اَپ۔
پروڈیوسر۔ (اندر سے) لیجئے میں بتاتا ہوں۔ ہماری پکچر کا نام ہو گا "دلربا"
پیالہ۔ (فوراً تال دے کر) ؎ دل جو سنبھلا تو مجھے دلربا یاد آیا۔
ڈائریکٹر۔ واہ پیالہ صاحب بھئی خوب نام ہے۔ بالم صاحب اور اگر ہیروئن کا نام بھی ہو دلرُبا تو بڑا مزا رہے اور پھر جب پکچر OPEN کرتا ہوں تو ہیروئن میونسپلٹی کے باغ میں دلربا بجا رہی ہے اور ہیرو ۔۔۔۔۔۔
سیٹھ۔ (بات کاٹ کر) ارے کھوب چے ڈی کٹڑجی پکچر کا نام "دلربا" ہیروئن کا نام بھی دلرُبا اور جو بجائے سو بھی دلرُبا۔ ایک پکچر میں تین تین دلرُبا۔ اے نام ٹھیک اے بلم جی۔
پروڈیوسر۔ (اور بھی زیادہ اکڑ کر) گُڈ۔ تو پکچر کا نام بھی طے ہو گیا۔ نوٹ کر لیجئے مسٹر پیٹھا والا۔ دلرُبا۔ (پیٹھا والا نوٹ بک نکال کر لکھ لیتا ہے) اب رہ گئی کاسٹ۔ لڑکا تو میرے خیال میں نیا ہی ڈالیں گے۔
مینیجر۔ جی ہاں۔ نیو فیس۔ نیو ٹیلنٹ۔ نیو فائینڈ۔ نیا فلمی چہرہ۔
پروڈیوسر۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہیروئن کونسی ہونی چاہئے۔

پیالہ - خورشید کماری کے متعلق کیا خیال ہے؟ بڑی TALENTED ہے ظالم

سیٹھ - اد جنگل کا شیر والی؟ بھئی کو یر اج او کچھ کھپ صورت نہیں۔

پیالہ - تو پھر کوئی سٹار کیوں نہ لی جائے مثلاً مرجینا یا سلطانہ چٹرجی یا ننھی بالا۔

سیٹھ - میرا کھیال میں سلطانہ اچھی اے۔

پیالہ - اچھی ہے؟ سیٹھ صاحب وہ تو ایک رتن ہے اے ہائے کیا آنکھیں ہیں ظالم کی اور بدن وہ تو گویا کسی دیوانے شاعر کا باغی خیال ہے۔ عرض کیا ہے رماچیں پر تال دیتا ہے)

پروڈیوسر - (اس کی بات کو ادھورا چھوڑ کر بیچ میں) ہاں تو پیالہ صاحب میں کہہ رہا تھا کہ ہیروئن بھی طے ہو گئی۔ صاحبان ابتدائی منزلیں تو سب طے ہو گئیں۔ مسٹر بیچھا والا نوٹ کر لیجئے سلطانہ سے کنٹریکٹ کرنا ہے۔ مسٹر جھن جھن والا آپ دلربا کے SCRIPT پہ آج سے ہی کام شروع کر دیجئے۔ پیالہ صاحب آپ آفس سے دو درجن ماچسیں لے لیں اور دھنیں تیار کرنی شروع کر دیں اور مسٹر بیچھا والا فی الحال ہماری تقدیر آپ کے ہاتھ ہے آپ کی پبلسٹی پر سب کچھ منحصر ہے۔

مینیجر - فکر نہ کریں بالم صاحب۔ بیچھا والا تیس کروڑ جنتا کے دل کی دھڑکنیں گن سکتا ہے بیچھا والا کی زبان میں وہ جادو ہے جو مٹی کو بھی سونا بنا دے ملاحظہ ہو۔ رقص و موسیقی سے لبریز فلم۔ حسن، اور فن کا لاثانی شاہکار۔ ایک ایسا افسانہ جس میں رومان، قہقہے، رقص، موسیقی اور آنسو یکجا ملیں گے۔ اچھوتی کہانی، نیا پلاٹ، محبت کی انوکھی داستان

فرض اور محبت میں جنگ، ملکۂ ترنم، نئی دریافت، نیا فلمی چہرہ۔ سیٹھ صاحب ہر گلی کوچے میں دیواروں پر، درختوں پر، سڑکوں پر ریل گاڑیوں پر، زمین پر آسمان پر بلکہ ہر نوجوان کے دل پر، میرے پوسٹر لگے ہوں گے، دلرُبا، دلرُبا، سیٹھ کوڑی مل کروڑی مل کا نیا شاہکار دلرُبا۔

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

رات کی دنیا

سلطان سکندر

رات کی دُنیا

جمعہ کا دن تھا۔ عرش پر چھٹی منائی گئی، چند فرشتے انسانوں کے روپ میں زمین پر دن گذارنے آئے، یہاں انسانوں کو دنیاوی کاروبار میں منہمک دیکھ کر ہنسنے لگے کہ خوب اشرف المخلوقات ہے، اپنے خالق کی طرف دھیان ہی نہیں۔ اور ہم چوبیس گھنٹے اللہ ہو اللہ ہو کرنے والے مگر اشرف تو کجا اعلیٰ مخلوق بھی نہیں کہلاتے۔ کیا انصاف ہے، بیزار ہو کر واپس جانے کو تھے کہ اذان سنائی دی ایک نے کہا آسمان پہونچنے میں دیر ہو جائے گی یہیں نماز پڑھ لو، دوسرے نے کہا، انسان کی نماز خاک ہو گی۔ ہم نوری ہیں عرش ہی پر نماز پڑھیں گے سب اڑ گئے مگر ایک نہ گیا۔

فرشتے نے وضو کیا اور جماعت میں شامل ہو گیا۔ جب جماعت نے داہنی طرف سلام پھیرا تو فرشتے اپنے پاس والے شخص کو دیکھکر محو حیرت ہوا چہرے پر

پوڈر گالوں پر سرخی، آنکھوں میں کاجل کے علاوہ سرخ پتلون اور نیلے رنگ کی قمیص کچھ ایسی دلکش ثابت ہوئی کہ بائیں طرف سلام کرنا بھول گیا۔ اس انہماک میں فرشتہ باقی نماز نہ ختم کرسکا، جب لوگ مسجد سے باہر نکلنے لگے تو فرشتہ اس شخص سے گویا ہوا:

"آپ کون ہیں جناب والا! آپ کے گالوں کی رنگینی تو ہمارے بہشت کے خوبصورت ترین پھولوں میں بھی نہیں، اور جناب آنکھوں کی سیاہی تو ستارۂ زحل کو بھی شرماتی ہے، پھر یہ گالوں کی درخشائی خدا جھوٹ نہ بلائے یہ تو ہمارے بڑے فرشتے کے نور کو بھی خیرہ کردینے والی ہے۔"

اس شخص نے حقارت سے فرشتہ کو دیکھا اور کہا "آپ بھی کوئی بڑے گنوار معلوم ہوتے ہیں ہندوستان میں کون ہے جو مجھے نہیں پہچانتا"

فرشتے نے گھبرا کر معذرت کی "جی ہماری اقلیم میں آپ جیسے لوگ ذرا کم دکھائی دیتے ہیں، آپ کوئی برگزیدہ شخص معلوم ہوتے ہیں، بلکہ ہو نہ ہو آپ کوئی ولی ہیں۔"

"میں ولی وغیرہ نہیں —— بلکہ ایکٹر ہوں ایکٹر۔"

فرشتہ بیچارہ نے ایکٹر کا لفظ کبھی نہیں سنا تھا اس لئے یہ سمجھ کر شاید امام مہدی یا مسیح موعود ہے، جھٹ دوزانو بیٹھ گیا اور ایکٹر کے پاؤں دابنے لگا۔

—— ایکٹر نے گنوار سمجھ کر رعب جمانا شروع کیا

"میرے مسجد میں آنے سے دھوکہ نہ کھاؤ آج تو میں نمازیوں کے ایکٹ اور موشن دیکھنے آیا تھا، کیونکہ کل مجھے ایک نمازی کا پارٹ ادا کرنا ہے۔ ورنہ مجھے

مسجد سے کیا سروکار!"

فرشتے نے تصدیق کرتے ہوئے کہا "لاریب آپ جیسے خدا شناسوں کو مسجد سے کیا سروکار!"

ہماری برادری میں انسان جتنا بھی شراب خوار، بدکار اور پاجی ہو اتنی ہی زیادہ ترقی کرتا ہے، اور ایمان کی تو یہ ہے کہ ان ہی خوبیوں سے ایکٹر ڈائرکٹر بن جاتا ہے، تو اگر مجھے دیکھ کر حیران ہو گیا ہے تو میرے استاد ڈائرکٹر کو دیکھ کر تیرا کیا حال ہوگا،" ایکٹر نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"حضور" فرشتہ نے دست بستہ کہا "میں آپکا بڑا ممنون ہوں، آج آپ سے مل کر میرے ایمان میں پختگی پیدا ہوئی، میں خلوص دل سے توبہ کرتا ہوں کہ اب انسان کو بُرا بھلا نہ کہوں گا، سچ ہے، رب العالمین کا کوئی کام عقل و حکمت سے خالی نہیں ہے اب سمجھا کہ انسان کو اشرف المخلوقات کیوں کہا جاتا ہے" یہ سنکر ایکٹر نے فاتحانہ انداز سے جیبی کنگھی نکالی، بال سنوارے، ٹوپی ذرا ترچھی کی، چمڑے میں لپٹا ہوا بید اٹھایا اور چلنے کو تھا کہ فرشتہ نے زاری سے کہا۔

ساحل پر لاکر مجھے پیاسا نہ لوٹائیے، مہربانی فرما کر اپنے استاد صاحب دام برکاتہ' کی زیارت بھی کرا دیجئے۔

دونوں روانہ ہو گئے

ایک سرسبز و شاداب باغ تھا موسیقی کی ہلکی اور دلنواز تالیوں سے فضا گونج رہی تھی، ایک طرف سے مرد آیا اور دوسری طرف سے ایک عورت، اور دونوں اس گرمجوشی سے ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو گئے کہ فرشتہ نے آنکھیں بند کرلیں

ایکٹر ـــ "آنکھیں کھول کر دیکھو آنکھیں تاکہ اس منظر کی رنگینی جذب کرسکو۔ ورنہ ایسے مزے مرجاؤ گے تو جنت میں بھی نصیب نہ ہوں گے"۔

فرشتہ بولا "آپ سچ کہتے ہیں جنت میں یہ سامان کہاں، سنتے ہیں شداد نے کوشش کی تھی، مگر وہ ناکام رہا، آپ لوگوں پر خدا کا خاص فضل ہے"۔

ایکٹر مسکرایا اور باغ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا، خدا کا خاص فضل تو اس پر ہے، فرشتہ نے ادھر دیکھا، مرد عورت کا منہ چوم رہا تھا، ادھر ڈائرکٹر نے نہ ایکٹر کے بغل گیر ہونے اور نہ ہی اس کے منہ چومنے کے طریقہ کو پسند کیا، بلکہ آگے بڑھ کر خود اپنے پسندیدہ طریقہ کا مظاہرہ کیا، حاضرین میں سے ایک نے کہا سبحان اللہ سٹ پر بڑے بڑوں کو بتاتے ہوئے آپ ہی کو دیکھا ہے۔ فرشتہ بیچارہ نے حیران ہو کر پوچھا "یہ بتانے والا کون شخص ہے؟"

ایکٹر نے کہا "یہی تو ہمارا استاد ڈائرکٹر ہے فرشتہ نے برجستہ کہا "استاد برحق ہے"

سورج غروب ہو چکا تھا، فرشتہ اشرف المخلوقات کے اس عظیم پیشہ کے ہنگاموں میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ عصر اور مغرب کی نماز تو کجا، آسمان پر جانا بھی بھول گیا۔

ادھر آسمان پر حاضری لی گئی تو ایک فرشتہ غیر حاضر نکلا، اللہ میاں نے استفسار کیا ـــ تو عقل کل نے کہا کہ باری تعالیٰ چند فرشتے زمین کی سیر کو گئے تھے ـــ ایک ان میں سے جمعہ کی نماز کے لئے ٹھہر گیا تھا، ابھی تک نہیں لوٹا ہے مگر اب چونکہ اندھیرا ہو چکا ہے، اس لئے صبح جا کر تلاش کریں گے!

اللہ میاں عقل کل کے جواب پر مسکرائے اور فرمایا "تمہارے آسمان پر اندھیرا ہو چکا ہے مگر انسانوں کی دنیا رات کو بھی روشن رہتی ہے دن کی دنیا سورج

کی روشنی میں دنیا نہیں ہوتی، دراصل دنیا جس چیز کا نام ہے وہ رات ہے، تم نے دن کی دنیا دیکھی ہے، رات کی دنیا نہیں دیکھی۔"

"خیر ہمارا ایک شاگرد تو گیا ہے اس سے معلوم ہو جائے گا،" عقل کل نے کہا

"اگر وہ واپس آسکا تو" اللہ میاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عقل کل نے بڑے ادب سے سجدہ کیا اور کہا "رب العالمین ہاروت اور ماروت کا خیال نہ کیجئے۔"

اللہ میاں نے دربار برخواست کیا، ملائکہ مقربین کا بیان ہے کہ مسند ربانی سے اٹھتے وقت انکے لب ہل رہے تھے اور وہ کہہ رہے تھے "ماضی بھولنے کی نہیں یاد رکھنے کی چیز ہے"۔

آدھی رات کا وقت تھا، سین پر سین لئے جا رہے تھے، فرشتہ انہیں دیکھنے میں محو تھا کہ اسے پیاس لگی، ایکٹر نے نوکر کو پانی پلانے کا حکم دیا "مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا "مہمان ہیں۔ سمجھے"! نوکر مسکرایا اور گویا ہوا، "مگر ماسٹر جی! اب تو نہیں ہے، کھاتے وقت ڈائرکٹر صاحب کے یہاں کم پڑ گئی تو ہیروئن نے ہماری منگالی"۔ ایکٹر مسکرایا اور فرشتے کو اسی وقت شراب خانے لے گیا، فرشتہ ذرا گھبرایا اس لئے سادے پانی پر قناعت کر کے دوسری ملاقات پر پینے کا وعدہ کیا، ایکٹر نے شراب کا ایک بھرپور گلاس پی کر فرشتہ سے پوچھا۔

"کہو استاد کچھ لطف آیا؟"

"لطف کی نہ پوچھئے، آپ لوگوں کو کس عبادت کا صلہ ملا ہے، کہیں اسم اعظم تو یاد نہیں ہے؟"

"اسم اعظم وغیرہ ہم کچھ نہیں جانتے، ہم آرٹ جانتے ہیں آرٹ"۔

"ماشاء اللہ کیا آرٹ ہے، وہ نعمتیں جن کے لئے لوگ جنت میں ترستے ہیں آپ لوگوں کے قدموں میں ہیں اور تو اور جو حق عورتوں پر آپ کے استاد مدظلہٗ کو حاصل ہے اتنا حق تو فرشتوں کو پھلوں اور پھولوں پر بھی نہیں۔"

ایکٹر بے پروائی سے ہنسا اور بولا "دنیا کو عورت شادی کر کے ملتی ہے مگر ہم اس قید سے آزاد ہیں، ہاں ہمارے استاد البتہ اپنے تصرف کو مقدس بنانے کے لئے عورت کو بہن بیٹی بنا لیتے ہیں۔"

فرشتہ نے کہا "بیشک نیکوں کی یہی پہچان ہے" اس کے بعد وہ بڑی لجاجت کے ساتھ ایکٹر سے کہنے لگا ——————

"میرے رہبر! جہاں اتنا کرم کیا ہے وہاں ایک اور بھی کیجیے؛ تمام عمر آپ کا نام لوں گا۔"

ایکٹر نے پوچھا "وہ کیا"

فرشتہ نے سر جھکا کر شاگردانہ طور پر عرض کیا "مجھے اپنا آرٹ سکھا دیجئے۔"

ایکٹر مسکرایا اور قریب آکر فرشتہ کے کان میں کچھ کہا۔۔۔۔

دوسرے روز صبح عقل کل پتہ لیتے لیتے اسٹوڈیو پہونچا اور دیکھ کر حیران رہ گیا کہ فرشتہ۔ اسٹوڈیو میں ایکٹری کی درخواست لئے ہوئے کھڑا تھا۔